ڈاکٹر قمر زمان، محمد شیخ، بابر چودھری، قاضی کفایت اللہ اور ان جیسے دیگر لوگوں کے نام

قرآن سے دشمنی نہ کیجئے

قرآن کو قرآن کے کہے کے مطابق سمجھئے

حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب دامت برکاتہم

- مفتی جامعہ مدنیہ لاہور
- رئیس دارالافتاء والتحقیق، لاہور

ناشر

دارالامین، لاہور

گزارش

بسم اللہ حامدا و مصلیا

پرویز سے تو ملنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا اگرچہ پرویز کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ لاہور کے قاضی کفایت اللہ اور ڈاکٹر قمر زمان سے ملاقات بھی ہوئی اور ان کی کتابیں بھی پڑھیں اور کراچی کے محمد شیخ سے بھی ملاقات ہوئی اور ان کی آڈیو پر چند تقریریں سنیں۔ کراچی ہی کے ایک بابر چودھری ہیں جن کے بارے میں محمد شیخ کا دعویٰ ہے کہ وہ ان کے شاگرد تھے۔ یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ یہ اور ان جیسے بعض اور لوگ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن پاک کی صحیح خدمت کرنے کے بجائے صرف اپنے خود تراشیدہ افکار کی خاطر قرآن کو Exploit یعنی اس کا استحصال کر رہے ہیں۔

محض ہمدردی و خیر خواہی کی خاطر ہم نے فہم قرآن سے متعلق چند حقائق حوالہ قرطاس کر دیئے ہیں۔ اس مکتبہ فکر کے حضرات سے بھی اور دیگر عوام و خواص سے بھی ہماری گزارش ہے کہ زیر نظر کتابچہ کو ضد اور تعصب سے بالا ہو کر پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری اس کوشش کو قبول فرمالیں اور لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا دیں۔ آمین۔

عبدالواحد

دارالافتاء۔ جامعہ مدنیہ لاہور

ربیع الثانی 1425

فہرست مضامین

پہلا باب:	علم حاصل کرنے کا قرآنی طریقہ	4
	بیانِ قرآن منجانب اللہ ہے	7
	بیانِ الٰہی کی حقیقت	8
	قرآن کی اور اس کے بیان کی حفاظت اللہ نے اپنے ذمہ رکھی ہے	14
دوسرا باب:	قرآن کو سمجھنے کے لئے حدیث کی ضرورت کی چند مثالیں	19
	پہلی مثال	19
	دوسری مثال	20
تیسرا باب:	قرآن کے کہے کے مطابق قرآن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہونے والی بھیانک غلطیاں	22
	پہلی غلطی ......صلوٰۃ کی تعداد پانچ نہ ماننا	22
	دوسری غلطی......صلوٰۃ کی قرآنی حقیقت کو بگاڑنا	26
	تیسری غلطی ...... جنات کا انکار کرنا	35
	چوتھی غلطی ......حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ماننا	40
	پانچویں غلطی......ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو قرآن سے ثابت کرنا	44
	چھٹی غلطی ......حضرت آدم کی متعین ہستی ہونے کا انکار کرنا	51
	ساتویں غلطی ...... ملائکہ کا ذی حیات و ذی شعور ہستیاں ہونے کا انکار کرنا	53
	آٹھویں غلطی... ابلیس کا موجود فی الخارج ہستی ہونے کا انکار کرنا	59

پہلا باب

علم حاصل کرنے کا قرآنی طریقہ

کسی بھی علم کو حاصل کرنے کے لئے اس علم وفن کے ماہرین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے پڑتے ہیں مثلاً ڈاکٹر قمر زمان ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں۔ طب کی تعلیم انہوں نے ماہرین طب سے حاصل کی اور یونیورسٹی سے اس کی سند لی پھر دنیا نے ان کو ڈاکٹری کرنے کے قابل سمجھا۔

اب عقل تو یہ کہتی ہے کہ کوئی بھی علم اس کے ماہرین کے بغیر حاصل نہیں ہوتا اور قرآن بھی کہتا ہے کہ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (رسول لوگوں کو کتاب وحکمت سکھاتے ہیں)۔ جس کے مطابق صحابہؓ کو قرآن سیکھنے کی ضرورت تھی اور رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں سکھانا شامل تھا حالانکہ صحابہ تو عام طور سے ان احوال سے واقف تھے جن میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ جب صحابہؓ نے قرآن رسول اللہ ﷺ سے سیکھا تو بعد والوں کے لئے لازم تھا کہ وہ اہل علم صحابہ سے سیکھتے اور یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا اور فی الواقع ہوا بھی ایسے ہی۔

لیکن قرآن پاک اور عقل کے اس ضابطہ کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے کچھ حضرات یہ ہدایت دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے شروع ہونے والے مذکورہ علمی اور تعلیمی سلسلہ کی کوئی ضرورت نہیں اور اللہ تعالیٰ خود قرآن پڑھنے والے پر معانی و مفاہیم واضح کرتے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر زمان لکھتے ہیں۔

''ہر ہر شخص قرآن کو شروع سے آخر تک کھول کر پڑھ لے خود ہی ساری

بات سمجھ جائے گا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ اس کی انگلی پکڑ کر ہر نکتہ کو سمجھاتے جائیں گے اور معانی و مفاہیم واضح کرتے جائیں گے۔''

محمد شیخ کہتے ہیں:

''قرآن میں ہے: اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ رحمان (اس نے) علم دیا قرآن کا۔ اسی نے تو انسان کو خلق کیا ہے اور اس کو بیان کرنے کا علم دیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں اور ہمارے بارے میں Relationship بتائی (یعنی تعلق بتایا) لہٰذا اگر ہم اللہ پر توکل کریں اور اس کو پڑھنے کی کوشش کریں تو یہ اللہ کا Claim (دعویٰ) ہے کہ اگر آپ قرآن کو جاننا چاہیں تو اللہ علم دیتا ہے''۔

اسی وجہ سے محمد شیخ کہتے ہیں ''کہ محمد شیخ (یعنی خود ان) کو قرآن اللہ نے سکھایا ہے۔''

نیز وہ کہتے ہیں:

قرآن میں ہے: لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْاٰنَهُ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهُ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ یعنی کسی بھی پڑھنے والے کو اللہ کہتا ہے کہ قرآن جلدی جلدی مت پڑھو۔ ہمارے اوپر ہے اس کو جمع کرنا اور پڑھانا۔ پس جب ہم اسے پڑھیں تم اس پڑھائی کی اتباع کرو پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کا بیان کرنا''۔

اس آیت کا حاصل نکالتے ہوئے محمد شیخ کہتے ہیں ہم میں سے ہر پڑھنے والے کو

i- اللہ پڑھاتے ہیں۔

ii- اللہ علم دیتے ہیں۔

iii- بیان بھی اللہ ہی سکھاتے ہیں۔ (القرآن القرآن کے بارے میں کیا کہتا ہے)

ہم کہتے ہیں

ڈاکٹر قمر زمان اور محمد شیخ کی بات قرآن اور عقل دونوں ہی کے خلاف ہے۔

قرآن پاک میں وعظ و نصیحت بھی ہے اور دیگر مضامین بھی ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت پر تفصیلی کلام ہے اور ردِ شرک پر خوب زور ہے۔ اخلاق حسنہ کے بارے میں گفتگو ہے۔ ان مضامین کو حسب ضرورت مثالوں سے بھی سمجھایا اور سابقہ امتوں کے واقعات کو ان کے لئے دلیل بنایا۔ یہ مضامین سب خاص و عام کی ضرورت ہیں۔ اس لئے ان مضامین کے اعتبار سے قرآن پاک کو آسان فرمایا اور آیات کو واضح کیا اور ہر شخص کو دعوت دی کہ وہ ان مضامین میں غور کرے اور اگر نہیں کرتے تو کیا ان کے دلوں میں قفل پڑے ہوئے ہیں۔

ان مضامین کے علاوہ قرآن پاک میں احکام بھی ہیں اور عقائد کی باریکیاں بھی ہیں اور احکام کے اصول وضوابط بھی ہیں۔ ان باتوں کو کما حقہ سمجھ لینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ آخر سوچنے کی بات ہے کہ قرآن پاک میں قُرُوْءٌ کا لفظ آیا ہے جس کے عربی لغت میں حیض اور طہر دونوں ہی معنی ملتے ہیں۔ اب قرآن پاک میں اس لفظ سے کونسا معنی لیا جائے؟ کیا عام آدمی جس کو عربی ادب ولغت اور اصول دین سے واقفیت نہ ہو یہ کام کرسکتا ہے؟ اسی طرح قرآن پاک میں "کَلَالَہ" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے چند ایک معنی ہیں۔ اور تین معنی ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو مراد لیا جاسکتا ہے۔ اب ایک عام آدمی جس کو صرف قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنا آتا ہے وہ تین میں سے ایک معنی کی تعیین کس طرح کر سکے گا؟ نیز قرآن پاک میں ربوا اور سود کا ذکر ہے کہ یہ حرام ہے۔ اب یہ جاننا کہ ربوا کی کتنی شکلیں ہیں عام آدمی ان کو کیا سمجھ سکتا ہے؟ قرآن پاک کے ایسے ہی مضامین جو کہ بذات خود بہت سے ہیں ان کو سمجھنے اور جاننے کے لئے حکم دیا کہ کچھ لوگ مستقل وقت نکال کر ان کو سیکھیں رسول اللہ ﷺ سے یا آپ کے شاگردوں سے یا شاگردوں کے شاگردوں سے آخر سلسلہ تک اور دوسروں کو سکھائیں۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ۔ (سورة توبہ 122)

ترجمہ: سو کیوں نہ نکلا ہر ایک فرقہ میں سے ان کا حصہ تا کہ سمجھ حاصل کریں دین

میں اور تاکہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو (یعنی دین کے مسائل بتائیں) اور ان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے ڈرائیں۔

تعلیم کی نوعیت بیان قرآن اور تعلیم قرآن ہے

1- لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔ (تاکہ آپ لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دیں کہ جو ان کی طرف نازل کیا گیا)۔

رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی یہ بتایا گیا کہ آپ ﷺ لوگوں کو نازل شدہ کھول کھول کر بیان کر دیں۔ آپ ﷺ کے اولین مخاطب یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم عام طور پر سے عربی زبان سے خوب واقف تھے بلکہ ان کی زبان ہی یہ تھی۔ اور قرآن پاک کا نزول عربی میں ہی ہوا اور ڈاکٹر قمر زمان صاحب اور محمد شیخ صاحب وغیرہ کے بقول جب اللہ تعالیٰ نے خود بیان سکھا دیا تھا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کو پھر کس قسم کے بیان کی ضرورت ہوئی۔ بلا ضرورت بیان کرنا تو عیب ہے۔ جب ان کو بھی بیان کی ضرورت تھی تو بعد والوں کو اور ہمیں کیوں نہ ہوگی۔

2- يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ رسول ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

لوگوں پر تلاوت آیات سے قرآن کا پہنچانا ہو گیا۔ اس کے بعد کتاب وحکمت کی تعلیم جو رسول اللہ ﷺ صحابہ کو دیتے تھے وہ کتاب کو سمجھنے ہی کے لئے دیتے تھے۔ جب صحابہ کو تعلیم کتاب کی ضرورت تھی اور انہوں نے یہ عذر نہیں سمجھا کہ اللہ تعالیٰ تو ہماری انگلی پکڑ کر خود ہمیں قرآن سمجھا دیں گے تو دوسروں کو اس تعلیم سے بے نیازی کیونکر ہو سکتی ہے۔

بیان قرآن منجانب اللہ ہے

قرآن پاک میں ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔

(سورہ قیامہ)

بے شک ہمارے ذمہ اس کو (یعنی قرآن کو آپ کے سینہ میں) جمع کرنا ہے اور پڑھنا ہے (آپ کی زبان سے) تو اس کے پڑھے جانے کی پیروی کیجئے پھر ہمارے (ہی) ذمہ اس کا بیان ہے۔

بیان الٰہی کی حقیقت

بیان دو طریقے سے ہوتا ہے:

پہلا طریقہ: جو بات کہی اس سے معنی ومقصود کھل کے سامنے آ جائے مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہ رہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں فرمایا:

هٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ (آل عمران 128)

(یہ بیان ہے لوگوں کے واسطے)

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ (سورہ بقرہ: 178)

اسی طرح اللہ کھول کر بیان کرتے ہیں اپنی آیتوں کو لوگوں کے لئے......

تنبیہ: ان الفاظ قرآنی میں آیَاتِہٖ سے پورے قرآن پاک کی آیات مراد ہوں اس پر کوئی دلیل نہیں۔ لہٰذا ان سے بعض آیات مراد ہوں گی اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات کو اللہ تعالیٰ کھول کر بیان کرتے ہیں۔

دوسرا طریقہ: پہلے کلام میں کہیں کچھ اجمال و ابہام ہو۔ اب نیا کلام لا کر اس اجمال کی تفصیل کر دی جائے اور ابہام کو دور کر دیا جائے۔ یہ دوسرا کلام بھی بیان کہلائے گا اس کا ذکر قرآن پاک میں یوں ہے۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔ (سورہ قیامہ)

بے شک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو جمع کر دینا (تیرے سینہ میں) اور پڑھنا (تیری زبان سے) پھر جب ہم پڑھنے لگیں (فرشتہ کی زبانی) تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے پھر بلاشبہ ہمارے ذمہ اس کا بیان ہے۔

اس آیت میں یہ بتا کر کہ قرآن کا بیان ہمارے ذمہ ہے واضح کیا کہ قرآن علیحدہ

چیز ہے اور اس کا بیان علیحدہ چیز ہے جس کی صورت یہ ہے کہ قرآن پاک کے وہ مقامات جو خود پورے طور پر واضح نہیں ہیں مثلاً نماز کی صورت ہے، حج کی تفصیل ہے، قُرُوْءٌ سے کیا مراد ہے اور کَلَالَه کا کونسا معنی مراد ہے ان کا بیان بھی اللہ تعالیٰ نے دیا ہے لیکن قرآن کے علاوہ میں۔ قرآن پاک نے ایسی کوئی تصریح نہیں کی کہ اس کی ہر بات کا بیان لازمی طور پر قرآن میں ہوگا۔

لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ۔

ترجمہ: (تاکہ آپ لوگوں کے لئے کھول کر بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کیا گیا)۔

رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی یہ بتایا گیا کہ آپ ﷺ لوگوں کو نازل شدہ کھول کھول کر بیان کر دیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس کی ضرورت قرآن کے ان ہی مقامات میں ہوگی جن کا تفصیلی بیان قرآن میں موجود نہیں۔

اللہ تعالیٰ کے بیان کے غیر کتاب میں ہونے کی وضاحت

وحی نبوت و رسالت کا خاصہ لازم ہے

اِنَّا اَوۡحَيۡنَا اِلَيۡكَ كَمَا اَوۡحَيۡنَا اِلٰى نُوۡحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنۡ بَعۡدِهٖ وَ اَوۡحَيۡنَا اِلٰى اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ وَعِيۡسٰى وَاَيُّوۡبَ وَيُوۡنُسَ وَ هٰرُوۡنَ وَسُلَيۡمٰنَ وَاٰتَيۡنَا دَاوٗدَ زَبُوۡرًا۔ (نساء 235)

(اے نبی) بے شک ہم نے تیرے پاس ایسے ہی وحی بھیجی ہے جیسے نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کے پاس بھیجی ہے اور (جیسے) ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور انبیاء بنی اسرائیل کے پاس وحی بھیجی ہے اور عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کے پاس وحی بھیجی ہے اور داؤد کو ہم نے زبور دی ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی بھی نبی ایسا نہیں ہوا جس کی طرف وحی نہ کی گئی ہو۔

لیکن ہر وحی کتابی نہیں ہوتی

1- مذکورہ بالا آیت بھی اس کی دلیل ہے کیونکہ سب ہی انبیاء علیہم السلام کو کتاب یا صحیفے نہیں دیئے گئے۔

2- يَا نُوۡحُ اِنَّهٗ لَيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ (سورہ ہود، 46)

اے نوح وہ نہیں ہے تیرے گھر والوں میں۔ اس کے عمل خراب ہیں۔

جب طوفان نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا غرق ہوا اور آپ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض پیش کی تو یہ جواب دیا گیا۔ ظاہر ہے یہ کوئی کتابی وحی نہیں تھی۔

علاوہ ازیں حضرت نوح علیہ السلام کو کوئی کتاب یا صحیفہ ملنا ثابت نہیں۔

3- يَا لُوۡطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنۡ يَّصِلُوۡا اِلَيۡكَ فَاَسۡرِ بِاَهۡلِكَ بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّيۡلِ۔

(سورہ ہود: 81)

''اے لوط ہم بھیجے ہوئے ہیں تیرے رب کے۔ وہ ہرگز نہ پہنچ سکیں گے تجھ تک سو نکال لے جا اپنے لوگوں کو کچھ رات سے۔''

یہ فرشتے تھے جو حضرت لوط علیہ السلام کے پاس اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام اور وحی لائے تھے کہ آپ کی قوم پر عذاب آنے والا ہے اور آپ راتوں رات اپنے علاقے سے نکل جائیں۔ یہ بھی کتابی وحی نہیں تھی اور حضرت لوط علیہ السلام کو کتاب یا صحیفہ ملنا بھی ثابت نہیں۔

4- وَاِذۡ اَسَرَّ النَّبِىُّ اِلٰى بَعۡضِ اَزۡوَاجِهٖ حَدِيۡثًا فَلَمَّا نَبَّاَتۡ بِهٖ وَاَظۡهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيۡهِ عَرَّفَ بَعۡضَهٗ وَاَعۡرَضَ عَنۡۢ بَعۡضٍ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتۡ مَنۡ اَنۡۢبَاَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّاَنِىَ الۡعَلِيۡمُ الۡخَبِيۡرُ۔ (سورہ تحریم 3)

''اور جب چھپا کر کہی نبی نے اپنی کسی بیوی سے ایک بات پھر جب اس نے خبر کر دی اس کی اور اللہ نے جتلا دی نبی کو تو جتلائی نبی نے اس میں سے کچھ اور ٹلا دی کچھ۔ پھر جب وہ جتلائی عورت کو بولی آپ کو کس نے بتلا دی یہ۔ کہا مجھ کو بتایا بڑے جاننے والے اور بڑی خبر رکھنے والے نے۔''

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے ذاتی معاملہ میں سے کوئی خاص بات ایک اہلیہ محترمہ

سے خفیہ طور پر ارشاد فرمائی اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ کسی اور کو نہ بتانا۔ مگر وہ اہلیہ محترمہ ضعف بشری کی وجہ سے دوسری اہلیہ کو بتا بیٹھیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو سارا قصہ معلوم کروا دیا۔ لیکن قصہ بتانے کی تفصیل قرآن پاک میں نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ کتاب وقرآن کے علاوہ وحی تھی۔

غیر قرآنی یا غیر کتابی وحی احکام پر بھی مشتمل ہوتی ہے

1- مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ۔

(سورہ حشر 5)

''جو کاٹ ڈالا تم نے کھجور کا درخت یا کھڑا رہنے دیا اپنی جڑ پر سو اللہ کے حکم سے۔''

بنو نضیر کے محاصرہ کے وقت مسلمانوں نے ان کے درخت کاٹے باغ اجاڑے تاکہ ایک تو وہ اپنا مالی نقصان ہوتا ہوا دیکھ کر بند قلعہ سے باہر آئیں اور دوسرے کھلی جنگ میں درختوں کی رکاوٹ نہ رہے۔ دشمنوں نے اعتراض کیا کہ مسلمان خود تو فساد سے روکتے ہیں کیا درخت کاٹنا فساد نہیں ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی تصویب فرمائی کہ یہ ہمارے حکم سے ہوا۔ اور چونکہ یہ حکم قرآن پاک میں کہیں مذکور نہیں ہے اس لئے وہ قرآن کے علاوہ وحی تھی۔

2- يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ۔ (سورہ الصّٰفّٰت 102)

''کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں تجھ کو ذبح کرتا ہوں پس دیکھ تیری کیا رائے ہے بولا اے باپ کر ڈال جو تجھ کو حکم ہوتا ہے۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا جواب میں یہ کہنا اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (آپ کو جو حکم دیا گیا ہے آپ کر گذریئے) اس بات کی دلیل ہے کہ وہ حکم الٰہی تھا۔ اور یہ حکم الٰہی کتاب کے علاوہ خواب کی صورت میں حاصل ہوا۔ لہٰذا یہ کتاب الٰہی کے علاوہ وحی تھی۔

غرض قرآن سے یہ ثابت ہوا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک کتابی اور دوسری غیر

کتابی نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ غیر کتابی وحی تشریعی بھی ہوتی ہے یعنی احکام یا ان کے متعلقات پر مشتمل ہوتی ہے۔

غیر کتابی باتیں جو اللہ تعالیٰ کسی کو عطا کریں قرآن اس کو حکمت کا نام دیتا ہے۔

اگرچہ قرآن میں بھی حکمت موجود ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ (سورہ اسراء: 39)

یہ ہے ان حکمت کی باتوں میں سے جو وحی کی آپ کی طرف آپ کے رب نے۔

لیکن خود قرآن پاک ہی سے معلوم ہوا کہ حکمت کتاب الٰہی کے علاوہ بھی ہوتی ہے کیونکہ وہ غیر نبی کو بھی دی گئی ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ۔ (سورہ لقمان)

اور ہم نے لقمان کو (جو نبی نہ تھے) حکمت دی کہ شکر کر اللہ کا۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔

(سورہ بقرہ: 269)

عطا کرتا ہے حکمت جس کسی کو چاہے اور جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی خیر دی گئی۔

رسول اللہ ﷺ کو کتاب بھی ملی اور حکمت بھی ملی اور آپ دونوں کی تعلیم وتبلیغ کرتے تھے۔

يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (سورہ جمعہ 2)

رسول ان پر اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ۔ (سورہ بقرہ: 231)

اور یاد کرو اللہ کے احسان کو جو تم پر ہے اور اس کو جو اتاری تم پر کتاب اور

حکمت کہ تم کو نصیحت کرتا ہے اس کے ساتھ۔

بِہٖ میں جو ضمیر واحد غائب کی ہے اس سے لفظ مَا مراد ہے جو لفظی اعتبار سے واحد ہے۔ اور الکتاب اور الحکمۃ اس مَا کا بیان ہے اور چونکہ حرف عطف واو مغایرت کا معنی دیتا ہے اس لئے مَا اَنْزَلَ دو چیزیں ہوئیں ایک کتاب اور دوسری حکمت۔

نبی کے اجتہاد کو بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل ہوتی ہے ورنہ بدل دیا جاتا ہے اس لئے نبی کا اجتہاد بھی وحی ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جب جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں ان سے فدیہ لینے کا فیصلہ کیا تو عتاب یوں نازل ہوا

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ لَوْ لَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۔ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (سورہ انفال 70)

نبی کو نہیں چاہئے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو جب تک خون ریزی نہ کر لے ملک میں۔ تم چاہتے ہو اسباب دنیا کا اور اللہ کے ہاں چاہئے آخرت اور اللہ زور آور ہے حکمت والا ہے، اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اس لینے میں بڑا عذاب۔ سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں ملا حلال ستھرا اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ بخشنے والا ہے مہربان ہے۔

نبی کا اجتہاد بطور نبی کے ہوتا ہے عام مجتہد یا مرکزی اتھارٹی کے طور پر نہیں

اوپر کی آیت میں فرمایا مَا كَانَ لِنَبِيٍّ یعنی نبی کو نہیں چاہئے تھا مطلب یہ ہے نبی کا اجتہاد عام مجتہد یا مرکزی اتھارٹی کے طور پر نہیں بلکہ نبی کے طور پر ہوتا ہے۔

جب وحی کتابی اور غیر کتابی دونوں طرح ہوتی ہے تو حکم ہوا کہ رسول کی بتائی ہر بات کو قبول کرو یہ نہیں کہ صرف کتابی کو لو اور غیر کتابی کو چھوڑ دو کیونکہ دین کے تمام

قوانین کی تشکیل سے متعلق وہ ہر بات رسول کی حیثیت سے بتاتے ہیں محض حکمران کی حیثیت سے نہیں۔

مَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (سورہ حشر: 7)

(اور جو دے تم کو رسول لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو)

مَا کا لفظ عام ہے اور اس میں کتاب الٰہی اور اس کے نفاذ کی تمام تفصیلات شامل ہیں کیونکہ یہ دونوں ہی باتیں آپ ﷺ نے دی ہیں۔ اور خطاب بھی قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں سے ہے۔ یہاں غور کرنے کی یہ بات ہے کہ فرمایا: مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ یعنی جو کچھ تمہیں رسول دیں۔ یعنی جو حکم اور تفصیل وہ تمہیں دے رہے ہیں رسول کی حیثیت سے دے رہے ہیں۔ اور مَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (جس کام سے یہ تم کو روکیں تم رک جاؤ) یہ نہی اس بات پر قرینہ ہے کہ مَآ اٰتٰىكُمْ میں احکام اور اوامر بھی شامل ہیں۔

قرآن اور اس کا بیان خواہ وہ غیر کتابی ہو اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر رکھی ہے

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (سورہ حجر: 9)

ہم نے ہی ذکر (یعنی قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ قرآن پاک کا بیان جس کے بغیر قرآن پاک کے متعلقہ حصوں کو کما حقہ سمجھنا مشکل ہے اس کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فرائض منصبی میں اس کو بیان کرنا شامل ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ جنہوں نے قرآن پاک کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے اس کے الفاظ کی حفاظت کے اسباب تو بنائیں لیکن اس کے بیان اور معانی کی حفاظت کے اسباب نہ بنائیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے بھی اسباب بنائے اور رسول اللہ ﷺ کے کہے ہوئے الفاظ اور مضامین اور

آپ ﷺ سے صادر شدہ اعمال وافعال جو کہ آپ ﷺ کا اسوہ مبارکہ تھا اور قرآن کا قولی و عملی بیان تھا ان کو محفوظ کرایا۔

قرآن کا غیر کتابی بیان حدیثوں میں محفوظ ہے

ہم کہتے ہیں کہ قرآن کے مجمل اور مبہم مقامات کے بیان کا دوسرا نام حدیث ہے۔ جو کوئی اس کا انکار کرے تو اس کے ذمے ہے کہ وہ قرآن کا بیان لائے، ورنہ تو گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اب قرآن کے ان مقامات کو سمجھنا ممکن ہی نہیں کیونکہ قرآن کی رو سے قرآن کو فی الجملہ سمجھنے کے لئے اس کا بیان ضروری ہے جو اب موجود نہیں، لہٰذا قرآن کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس سے خود قرآن پر اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر جو اعتراض پڑتا ہے اس کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

حدیث کی حفاظت ان لوگوں کے ذریعے کروائی جن کی تعریف خود قرآن نے کی

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین و تبع و تابعین رحمہم اللہ جیسے حضرات ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کرائی۔ قرآن پاک میں ہے۔ وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیروکار ہوئے نیکی کے ساتھ اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے)۔

یہ صرف کتابی قسم کے لوگ نہیں تھے بلکہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اسوہ مبارکہ کو اپنے اعمال وافعال میں اتارا۔ اسی کو اتباع کہتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر ان کی تعریف ہوئی۔ اور بعد والوں نے پہلوں کی اتباع کی اور اس پر قرآن پاک نے بعد والوں کی بھی تعریف کی۔ اس کے علاوہ ان حضرات نے رسول اللہ ﷺ کے کہے ہوئے الفاظ اور مضامین کی حفاظت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کیں۔ آخر حضرات عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابو ہریرہ، انس، ابوسعید خدری، عبداللہ بن عباس، ابی بن کعب، معاذ، عبداللہ بن مسعود اور حضرت عائشہ و دیگر امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہم

اجمعین کا اور کیا مشغلہ تھا۔ ان کی دنیوی مشغولیتیں کتنی تھیں یہ بھی ہمارے سامنے ہے اور دینی دلچسپی کتنی تھی یہ بھی کسی پر مخفی نہیں۔ علاوہ ازیں یہ تو چند نمایاں مثالیں ہیں۔ دیگر صحابہ اور وفود جو رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تھے وہ آخر کیا کرتے تھے۔

پھر تابعین و تبع تابعین کے دور میں لاکھوں انسانوں کا علمی مشغلہ ہی قرآن و حدیث تھا۔ عربی بہت سوں کی اپنی زبان تھی۔ علوم عربیہ ابھی زیر تدوین تھے۔ فلسفہ وغیرہ نے لوگوں میں ابھی رواج نہیں پایا تھا۔ خالص علوم نبوی کی تحصیل یہی ان کا مشغلہ تھا اور اسی میں انہوں نے اپنی زندگیاں قربان کیں۔ تابعین کے دور میں مجاہد، علقمہ، نافع، حسن بصری، ابن سیرین، ابوحنیفہ، شعبی، ابراہیم نخعی، اسود، قاسم بن محمد بن ابی بکر، سالم، عکرمہ، سالم بن یسار، ابن شہاب زہری رحمہم اللہ محض چند مثالیں ہیں ورنہ تو تاریخ ان کے ناموں سے بھری پڑی ہے۔ اور تبع تابعین میں امام مالک، ابو یوسف، محمد، زفر، حسن بن زیاد، اوزاعی، معمر، عبداللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید قطان، مکی بن ابراہیم اور حفص بن غیاث رحمہم اللہ ہیں۔ یہ بھی محض چند مثالیں ہیں جن پر ہم اختصار کی وجہ سے اکتفا کرتے ہیں ورنہ تو اس دور میں علم ہی یہی تھا اور اسی علم کا ہر جگہ چرچا اور رواج تھا۔

ان تین ادوار میں یعنی صحابہ، تابعین، اور تبع تابعین کے ادوار میں احادیث کی جمع و تدوین مکمل تھی۔ صحابہ کے دور میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں احادیث لکھیں اور اس مجموعہ کا نام صادقہ تھا۔ اس میں پانچ ہزار سے زائد حدیثیں تھیں۔ اس صحیفے سے بعد کے محدثین نے بہت سی حدیثیں نقل کی ہیں۔ تابعین کے دور میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار لکھی جو انکے بہت سے شاگردوں نے نقل کی۔ اور سرکاری طور پر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دور خلافت میں ابن شہاب زہری اور مکحول کو مامور کیا کہ وہ احادیث نبوی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال وافعال یعنی آثار کو جمع کر دیں۔ اس طرح ایک بہت بڑا ذخیرہ سرکاری کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔

تبع تابعین کے دور میں نمایاں شخصیت امام مالک کی ہے۔جنہوں نے موطا امام مالک لکھی اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے موطا امام محمد لکھی۔ان کے علاوہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں وجود میں آئیں۔اور یہ سب کتابیں اب بھی عام دستیاب ہیں۔

غرض قرآن اور بیان قرآن (یعنی حدیث) کے تعلیم وتعلم کا ایک سلسلہ تھا جو رسول اللہ ﷺ سے شروع ہوا اور نسل در نسل بغیر کسی انقطاع کے چلتا رہا۔ یہ ایک ادارہ (Institution) تھا جس کی صحابہ کے دور میں کئی شاخیں قائم ہوگئی تھیں۔ایک ایک اہل علم صحابی خود ایک مرکزی حیثیت رکھتے تھے اور علاقے والے ان کے پاس دین کا علم یعنی قرآن وحدیث سیکھنے آتے تھے۔اور وہ تعلیم عملی Practical اور زبانی (Verbal) دونوں ہی قسموں پر مشتمل تھی۔

پھر ذرا سوچا جائے تو رسول اللہ ﷺ سے جو احادیث منقول ہیں وہ صرف ہزاروں میں ہیں۔تو کیا اتنی احادیث کو یاد رکھنا امت کے لئے کوئی مشکل کام تھا۔محض دنیوی رہنماؤں کے اقوال و احوال کی حفاظت کا قومیں کیا کچھ اہتمام نہیں کرتیں تو کیا محسن انسانیت اور افضل الرسل کے اقوال وافعال کو یاد رکھنے اور ان کو اپنانے سے یہ امت ایسی ہی عاجز تھی۔حاشا وکلا ایسی بات متصور ہی نہیں اور ایسا تصور کرنا بہت غیر معقول بات ہے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ تو بہت بعد کے لوگ ہیں۔ان کو تو جمع شدہ حدیثوں کے ذخیرے ملے ہیں۔ وہ ذخیرے انہوں نے اپنے مختلف اساتذہ سے حاصل کئے اور پھر حدیثوں کا ایک مختصر انتخاب کتابی شکل میں پیش کیا۔خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں امام اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں حاضر تھا وہاں ہمارے ساتھیوں میں سے کسی کی زبان سے نکلا'' کاش تم رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کے بارے میں کوئی مختصر سی کتاب جمع کر دیتے''۔ خطاب تمام حاضرین مجلس سے تھا لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں نے اس کتاب کو جمع کرنا شروع کر دیا۔اور اس کے نام ہی میں انہوں نے وضاحت کر دی کہ انہوں نے اس میں تمام صحیح حدیثیں جمع نہیں کیں۔ بلکہ وہ صحیح

حدیثوں کا ایک اختصار و انتخاب ہے اور نام یہ رکھا اَلْجَامِعُ الْمُسْنَدُ الصَّحِيحُ الْمُخْتَصَرُ مِنْ أُمُوْرِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ وَ سُنَنِہٖ وَ أَيَّامِہٖ۔

تنبیہ: ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے رطب ویابس کے مجموعوں سے یہ چند ہزار جواہر ریزے چنے ہوں بلکہ انہوں نے صحیح احادیث میں سے چند کا انتخاب کیا ہے۔خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

ما ادخلت فی کتابی الجامع الا ما صح و ترکت جملة من الصحاح خشیة ان یطول الکتاب۔

> میں نے اپنی کتاب جامع میں صرف صحیح حدیثیں درج کی ہیں اور میں نے صحیح حدیثوں کا ایک بڑا مجموعہ اس خوف سے درج نہیں کیا کہ کتاب بہت طویل ہو جائے گی۔

اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

انما اخرجت هذا الکتاب وقلت هو صحاح و لم اقل ان مالم اخرجه من الحدیث فی هذا الکتاب فهو ضعیف۔

> میں نے اس کتاب میں حدیثیں درج کی ہیں اور کہا کہ یہ حدیثیں صحیح ہیں اور یہ نہیں کہا کہ جو حدیثیں میں نے اس کتاب میں ذکر نہیں کیں وہ صحیح نہیں ہیں۔

دوسرا باب

قرآن کو سمجھنے کیلئے حدیث کی ضرورت کی چند مثالیں

پہلی مثال

سورہ جمعہ کی یہ آیت ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِىَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَ ذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعلَمُوْنَ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ (سورہ جمعہ: 9-10)

اے ایمان والو جب ندا کی جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو جلدی کرو اللہ کے ذکر کی طرف اور خرید و فروخت کو چھوڑ دو۔ یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم کو سمجھ ہے۔ پھر جب پوری ہو چکے نماز تو پھیل جاؤ زمین میں اور تلاش کرو اللہ کا فضل۔

ان آیتوں میں چند باتیں قابل غور ہیں

1- جمعہ کے دن صلوٰۃ کیلئے ندا کی کیا صورت ہے

2- جمعہ کے دن صلوۃ کا کیا وقت ہے۔

3- جمعہ کے دن صلوٰۃ کی کیا کیفیت ہے۔

4- ذکر اللہ سے کیا مراد ہے اور اس کی کیا کیفیت ہے۔

5- جمعہ کے دن کی صلوٰۃ کے بعد زمین میں پھیل کر کیا دنیوی کمائی کرنا ضروری ہے یا اختیاری ہے کیونکہ اِنْتَشِرُوْا اور اِبْتَغُوْا دونوں امر کے الفاظ ہیں اور امر کبھی وجوب کیلئے ہوتا ہے اور کبھی اباحت یعنی اختیار کیلئے ہوتا ہے۔

ان باتوں کا قرآن پاک میں کہیں ذکر نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ظاہر ہے کہ ان پر

کسی نہ کسی صورت میں عمل کیا ہوگا اور اوپر ہم بتا چکے کہ قرآن کے مطابق آپ کا وہ عمل بطور رسول کے تھا جو ہمارے لئے بھی اتنی ہی حجت و دلیل ہے جتنا کہ اس دور کے لوگوں کیلئے تھی۔

دوسری مثال

وَاَذِّنْ فِىْ النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاتُوْكَ رِجَالًا وَعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوْا اسْمَ اللّٰهِ فِىْ اَيَّامٍ مَعْلُوْمَاتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوْا الْبَائِسَ الْفَقِيْرَ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ۔ (سورہ حج: 29-27)

اور آواز لگاؤ لوگوں میں حج کیلئے کہ آئیں تمہارے پاس پیادہ اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر جو چلے آئیں دور راہوں سے تاکہ حاضر ہوں اپنے فائدہ کی جگہوں پر اور لیں اللہ کا نام معلوم دنوں میں ان چوپایوں پر جو اللہ نے ان کو دیئے۔ سو کھاؤ ان (ذبح شدہ) چوپایوں سے اور کھلاؤ برے حال والے محتاج کو۔ پھر چاہیے کہ دور کریں اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی منتیں اور طواف کریں قدیم گھر کا۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا۔ (سورہ بقرہ: 158)

بلاشبہ صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں تو جو کوئی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کچھ گناہ نہیں ہے اس میں کہ وہ ان دونوں کا چکر کاٹے۔

فَاِذَا اَفَضْتُمْ مِنْ عَرَفَاتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ۔

(سورہ بقرہ: 198)

پھر جب تم لوٹو عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو مشعر حرام کے پاس۔

اَتِمُّوْا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ (سورہ بقرہ: 196)

پورا کرو حج کو اور عمرہ کو اللہ کے لئے

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ (سورہ بقرہ: 200)

پھر جب تم پورے کر چکو حج کے کام تو یاد کرو اللہ کو۔

ان آیتوں میں بھی چند باتیں قابل غور ہیں۔

1- حج کو مکمل کرنے کیلئے مناسک کون کون سے ہیں۔
2- عرفات جانا ہے اور واپس بھی آنا ہے۔ وہاں کب جائیں گے اور وہاں سے کب آئیں گے۔
3- مشعر حرام میں کتنی دیر ٹھہرنا ہے۔ پھر مشعر حرام سے آگے منی جانا ہے یا نہیں۔ اگر جانا ہے تو وہاں زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ ٹھہرنا ہے۔
4- بیت اللہ کے طواف کی کیا صورت ہوگی۔
5- صفا اور مروہ کے طواف کی کیا صورت ہوگی۔

ان باتوں کا قرآن پاک میں کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں حج کیا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ آپ ﷺ نے وہ حج کسی نہ کسی صورت میں کیا ہوگا۔ آپ کا وہ عمل رسول کی حیثیت سے تھا اس لئے وہ ہمارے لئے بھی اتنا ہی حجت و دلیل ہے جتنا اس دور کے لوگوں کے لئے تھا۔

ان دونوں مثالوں کی مذکورہ باتوں کی تفصیل کا ہمارے پاس چونکہ صرف ایک ہی ذریعہ ہے جو کہ حدیث رسول ہے تو ثابت ہوا کہ قرآن پاک کی بعض باتوں کو کما حقہ سمجھنے کے لئے حدیث ناگزیر ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ۔ (سورہ حجر: 9)

چونکہ اصل حفاظت تو اس وقت ہے جب الفاظ کے ساتھ ساتھ معانی کی بھی ہو تو نتیجہ یہ نکلا کہ وہ حدیثیں جن پر قرآن فہمی موقوف ہے ان کی بھی حفاظت اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہو۔

یہاں ہم نے صرف دو مثالیں ذکر کی ہیں ورنہ اگر تفصیل میں جائیں تو قرآن فہمی کیلئے اور بہت سی احادیث ناگزیر ہیں۔

تیسرا باب

قرآن کے کہے کے مطابق قرآن کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہونے والی بھیانک غلطیوں میں سے چند ایک مثالیں

پہلی غلطی: صلوٰۃ کی تعداد پانچ نہ ماننا

ڈاکٹر قمر زمان کہتے ہیں:

"الصلوۃ" کی تعداد کا حکم قرآن میں سورہ ہود کی آیت نمبر 114 میں بلاشک وشبہ محکم انداز میں وارد ہوا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ (اور قائم کرو دن کے دونوں سروں پر اور کچھ رات گزرنے پر)

اس آیت کا ترجمہ کسی طرح بھی اس کے علاوہ نہیں ہو سکتا۔ طَرَفَيِ النَّهَارِ کے معنی دو طرف ہی ہو سکتے ہیں۔ البتہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 78 میں اَقِمِ الصَّلٰوةَ کا حکم آیا ہے لیکن اس آیت سے بھی تعداد صلوٰۃ تین ہی ثابت کی جا سکتی ہے کسی صورت بھی پانچ نہیں۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ۔

صلوٰۃ قائم کرو زوال آفتاب کی ساعتوں سے لے کر رات کے اندھیرے تک۔

اس آیت کریمہ میں صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم زوال کے بعد سے لے کر

رات کے اندھیرے تک ہے......

یہاں صلوٰۃ کی دو کی تعداد کا بیان نہیں ہے بلکہ عرصہ دراز کا بیان ہے کہ دن کو سورج جب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو دن کے دوسرے کنارے کی صلوٰۃ کا وقت ہو جاتا ہے اور سورج کے ڈھلتے ہوئے اوقات میں کسی وقت بھی یہ صلوٰۃ ادا کی جاسکتی ہے۔

جب کہ صلوٰۃ عشاء غَسَقِ الَّيْلِ یعنی رات کے گہرے اندھیرے تک ادا کی جاسکتی ہے۔"

ڈاکٹر قمر زمان صاحب کی اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کی رو سے صلوٰۃ کی تعداد فقط تین ہے۔ ایک صلوٰۃ فجر دوسری صلوٰۃ عشاء اور تیسری زوال آفتاب کے وقت سے لے کر رات تک۔

ہم کہتے ہیں کہ صلوٰۃ کے اوقات کا مندرجہ ذیل تین آیتوں میں ذکر ہے اور کل ملا کر پانچ نمازیں بنتی ہیں۔

صلوٰۃ فجر اور صلوٰۃ عشاء

1- مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ۔ **(سورہ نور 58)**

صلوٰۃ فجر سے پہلے اور جب تم اپنے کپڑے اتارتے ہو دوپہر کے وقت اور صلوٰۃ عشاء کے بعد۔

اس آیت میں تعیین کے ساتھ دو نمازوں کا ذکر ہے یعنی فجر اور عشاء۔

صلوٰۃ عصر اور صلوٰۃ مغرب

2- اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ۔ **(سورہ ھود: 116)**

آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں میں اور رات کے کچھ قریبی حصوں میں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دن کے دو سروں پر نماز پڑھنی ہے یعنی فجر کے وقت اور عصر کے وقت جو کہ دن کا دوسرا سرا ہے۔ اس طرح اس آیت سے تیسری نماز بھی ثابت ہوئی غروب آفتاب سے پیشتر دن کے آخری حصے میں (یعنی عصر کی نماز)۔

عصر کی نماز کے بارے میں اس حد تک تو کسی نہ کسی درجے میں ڈاکٹر قمر زمان متفق ہیں کہ یہ دن کے دوسرے سرے میں پڑھنی ہے لیکن اس کے بعد انہوں نے ہاتھ دکھانے کی کوشش کی اور آیت اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ۔ کو اس بات کی دلیل بنایا کہ عصر کی نماز کا وقت زوال آفتاب کے وقت سے شروع ہوتا ہے حالانکہ یہ دونوں آیتیں اپنے معنی اور مضمون میں مختلف ہیں۔

مثلاً جون کے مہینے میں سورج کے زوال کا وقت دن کے بارہ بجے کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ غروب آفتاب تک یہ سات گھنٹے سے اوپر کا وقت بنتا ہے۔ ان صاحب کے بقول یہ سات گھنٹے کی مدت دن کا دوسرا کنارہ اور سرا ہے۔ چادر کے دو کنارے ہوں کیا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چادر کو لمبائی میں دو حصے میں کر دیا جائے اور یہ چادر کے دو کنارے اور سرے بن گئے۔ ایسی بات آخر کونسی لغت اور کونسی عقلی دلیل سے ثابت ہے۔ اور کچھ نہیں تو قرآن پاک ہی سے طرفین کا یہ معنی ثابت کرتے۔ کیا ڈاکٹر قمر زمان صاحب کی عقل وفہم بھی کوئی Authority ہے کہ ہم اس کے پابند ہوں؟

چادر کا ایک بیچ کا بڑا حصہ ہوگا۔ اس حصے کے دونوں طرف جو تھوڑا تھوڑا حصہ ہوگا چادر کا کنارہ اور سرا کہلاتا ہے۔ ایسے ہی دن کا ایک بڑا بیچ کا حصہ ہوگا اور اول و آخر کا تھوڑا تھوڑا حصہ اس کے کنارے اور سرے اور Ends ہونگے۔

غرض اس آیت سے تیسری صلوٰۃ عصر کی ثابت ہوتی ہے لیکن اس کا وقت زوال آفتاب شروع ہونے کے بہت بعد میں ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اس آیت میں ہے وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ (یعنی آپ صلوٰۃ قائم کیجئے رات کے کچھ اولیں حصوں میں۔

ہم کہتے ہیں زلف میں قریب کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰهِ زُلۡفٰی۔ (سورہ زمر3)

ہم ان کی عبادت نہیں کرتے مگر اس لئے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کے درجے میں پہنچا دیں۔

یہاں نہار یعنی دن کے بعد زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ کے ذکر سے مراد ہیں رات کی گھڑیاں جو دن کے قریب ہوں۔ اسی لئے علامہ محمد اسد نے بھی جن کا ترجمہ ڈاکٹر قمر زمان صاحب نے نقل کیا ہے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

As well as during the early watches of the night.

قرآن پاک میں ز ل ف کے مادے کے ساتھ جو استعمال ہے اس کے مطابق زُلَفًا مِّنَ الَّیۡلِ کا ترجمہ یہی زیادہ مناسب ہے کہ رات کی اولین گھڑیوں میں۔

جن حضرات نے اولیں کی قید نہیں لگائی اور صرف یوں لکھا ''رات کے کچھ حصوں میں'' ان کے ساتھ کچھ مخالفت نہیں کیونکہ انہوں نے اولیں حصوں کی نفی نہیں کی۔

چونکہ صلوٰۃ عشاء کا وقت کچھ رات گزرنے پر یا رات گئے ہے تو رات کی اولیں گھڑیوں کی صلوٰۃ اور ہے اور صلوٰۃ عشاء اور ہے۔ رات کی اولیں گھڑیوں کی صلوٰۃ ہی کو صلوٰۃ مغرب کہا جاتا ہے اور یہ صلوٰۃ قرآن ہی سے ثابت ہوئی۔

صلوٰۃ ظہر

3- اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوۡکِ الشَّمۡسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیۡلِ (سورہ اسراء 78)

نماز قائم کرو زوال آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک

دلوک شمس کا ترجمہ زوال شمس ہے زوال آفتاب عین نصف نہار کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے اس طرح یہ دن کا وسطی حصہ ہوتا ہے اور اس کو دن کا کنارہ کہنا بڑی غلطی ہے اس بات کو ہم اوپر تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

اس آیت میں زوال آفتاب کے شروع ہونے کے بعد اول وقت میں بھی صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم ہے اور چونکہ یہ دن کا وسطی حصہ ہے آخری نہیں لہٰذا اس وقت کی نماز دن کے آخری حصہ میں پڑھی جانے والی نماز سے مختلف ہوگی۔ اور اس کو ہم صلوٰۃ ظہر

کہتے ہیں۔

اس طرح قرآن پاک کے واضح الفاظ سے پانچویں یعنی صلوٰۃ ظہر بھی ثابت ہوئی۔ اور یہی تعداد ہمیں حدیث رسول ﷺ سے بھی ملتی ہے۔

دوسری غلطی: صلوٰۃ کی قرآنی حقیقت کو بگاڑنا

ڈاکٹر قمر زمان حقیقت صلوٰۃ کے بارے میں تفصیل بیان کرتے ہیں:

''آیئے دیکھتے ہیں کہ قرآن صلوٰۃ کا کیا مقام متعین کرتا ہے۔ سورۃ البینہ کی آیت نمبر 5 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِیَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِیۡنَ لَهُ الدِّیۡنَ حُنَفَآءَ وَیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤۡتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡقَیِّمَۃِ۔

اور انہیں تو صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبدیت اختیار کیے رکھیں اس حالت میں کہ دین کو اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے یعنی صرف اللہ کے لئے حنیف ہو کر اور الصلوٰۃ کو قائم کریں اور الزکوٰۃ کے فریضہ کو ادا کریں اور یہی دین قیم ہے۔ (البینہ 5)

یعنی اس آیت میں دین قیم کو اللہ کی خالص بندگی سے مقید کیا گیا اور اس دین قیم کے دو ستون الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ بتائے گئے......

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا موضوع ہی دین قیم ہے اور قرآن میں اللہ پاک نے دین قیم کو ہی بمعہ تمام تفصیلات اور جزئیات بیان فرمایا......

آیئے دیکھتے ہیں کہ اللہ نے جس صلوٰۃ کو دین قیم قرار دیا ہے وہ قرآن میں کس شکل میں بیان ہوئی ہے......

قرآن میں صلوٰۃ کسی جگہ تو مکمل دین کے حوالے سے بیان ہوئی ہے تو کہیں صلوٰۃ سے وہ علامتی عمل مراد لیا گیا ہے جسے آجکل کی اصطلاح میں نماز کہتے ہیں......

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جس اصطلاح کو پسند فرمایا ہے وہ صلوٰۃ ہے جس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس میں نبی کی تمام تر زندگی سما جاتی ہے۔ سورہ ابراہیم کی آیت نمبر 37 میں سیدنا ابراہیم کی وہ دعا مذکور ہے جب وہ سیدنا اسماعیل کو ایک ایسی وادی میں لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں جہاں زراعت نہیں ہوتی تھی۔

اِنِّیۡٓ اَسۡکَنۡتُ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ بِوَادٍ غَیۡرِ ذِیۡ زَرۡعٍ عِنۡدَ بَیۡتِکَ الۡمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ۔

اے میرے رب میں نے ایسی وادی میں جہاں زراعت نہیں ہوتی اپنی اولاد کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا تا کہ وہ صلوٰۃ قائم کریں۔

اب سوچنے کی بات ہے کہ سیدنا ابراہیم نے اللہ کے دین کے لئے سیدنا اسماعیل کی اتنی بڑی قربانی دی تو کیا صرف نماز پڑھانے کے لئے دی تھی؟ یا اس صلوٰۃ کا کوئی اور مفہوم ہے۔

اور اگر سیدنا اسماعیل کی قربانی صرف نماز پڑھانے کے لئے ہی تھی تو ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ نہ صرف سیدنا اسماعیل بلکہ ان کی اولاد جس میں رسالت مآب بھی شامل تھے صرف نماز ہی پڑھتے اور پڑھاتے رہتے اور اس تمام جدوجہد کی ضرورت ہی کیا تھی جو رسالت مآب نے اتنی مصیبتیں اٹھا کر کی اور ایک معاشرے کو مدینہ میں قائم کر دکھایا دوسرے رسول بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ رسالت مآب کو تو اپنی امت کو صرف نماز کے پڑھنے پڑھانے کی ہی تلقین کرنی چاہئے تھی باقی جدوجہد انہوں نے کس حکم کے تحت کی؟......

یعنی ان آیات میں صلوٰۃ سے مراد وہ نظام ہے جو احکامات و اقدار الٰہی کے تحت متشکل ہوتا ہے اور جس میں پابند کیا جاتا ہے کہ انسان اپنی معیشت کا نظام خود ساختہ پیمانوں کے تحت نہیں بنائے گا بلکہ اس کے اصول اقدار الٰہی کے تحت بنانے پڑیں گے۔'' (حقیقت صلوٰۃ 4 تا 8)

ڈاکٹر قمر زمان آگے صفحہ 25 پر حکمت صلوٰۃ کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''اللہ تبارک تعالیٰ کسی بھی حکم کو بغیر حکمت بیان نہیں فرماتے۔ الصلوٰۃ کی بھی حکمت بیان کی گئی ہے ...... ارشاد ربانی اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ میرے ذکر کے لئے صلوٰۃ کو قائم کرو۔

اب سوال اٹھتا ہے کہ ذکر کیا ہے؟ کیا ذکر سے مراد صرف اللہ اللہ کا ورد ہے یا کچھ اور؟

قرآن کو اللہ تبارک تعالیٰ نے بڑے صاف الفاظ میں ذکر کہا ہے:

اَلۡقُرۡاٰنِ ذِی الذِّکۡرِ (38/1)

اور سورہ الحجر میں فرمایا:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ۔

ہم نے الذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں (15/9)

اب یہ واضح ہو جانے کے بعد قرآن ہی اللہ کا ذکر ہے سورہ طٰہٰ کی آیت کا مطلب بھی واضح ہو گیا۔

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ

(میرے ذکر کے لئے صلوٰۃ قائم کرو) (طہٰ 20/16)

یعنی اللہ کے قرآن کی حاکمیت اور احکامات قرآنی کے نفاذ کے لئے صلوٰۃ قائم کرو تا کہ ایسا مثالی معاشرہ قائم ہو جس کی بنیادیں اللہ کے کلام میں دیئے گئے اصولوں پر رکھی گئی ہوں۔ جس کے لئے شعوری طور پر اللہ کو حاضر جان کر ہر شخص اس بات کا اقرار کرے کہ اے اللہ میں آپ کے ہر حکم کی اطاعت کرتا ہوں میری زندگی آپ کے احکامات کی تکمیل کا مکمل نمونہ ہے میری زندگی کا ہر ہر لمحہ آپ کے احکامات کی فرمانبرداری ہی میں گزرتا ہے اور اس عبدیت کے شعوری اظہار کے لئے میں حاضر ہو گیا میرا مقصود آپ کے قوانین کا اس دنیا میں نفاذ ہے اور میں صرف اور صرف آپ کی ہی عبدیت اختیار کرتا ہوں اس

لئے میری عبدیت کا شعوری اظہار صلوۃ کی ادائیگی ہے۔

لیکن ہم نے اس عبدیت کو جو ہمارے لئے ہمہ جہت اور ہمہ وقت اللہ کے دیئے ہوئے اصولوں کے تحت زندگی گزارنے کا نام ہے عبادت میں بدل ڈالا اور اب ہماری صلوۃ میں سب کچھ ہوتا ہے لیکن وہ عبدیت نہیں ہوتی جس کے لئے ہم کو صلوۃ کا حکم دیا گیا تھا۔ ہم مقصود کو بھی بھول گئے اور صرف صلوٰۃ کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے جو مقصود بالذات کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھی۔

(حقیقت صلوٰۃ ص 23,24)

ہم کہتے ہیں

ڈاکٹر قمر زمان صاحب کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ صلوٰۃ بمعنی نماز جو کہ ایک عبادت ہے وہ ذریعہ ہے اس صلوٰۃ کا جس سے مراد وہ نظام ہے جو احکامات و اقتدار الٰہی کے تحت متشکل ہوتا ہے۔

ڈاکٹر قمر زمان کی یہ فکر سراسر غیر قرآنی ہے اور اس میں ان سے چند فاش غلطیاں ہوئی ہیں۔ یہ غلطیاں ذکر کرتے ہوئے ہم اصل قرآنی فکر کو بھی پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر زمان کی پہلی غلطی

ڈاکٹر قمر زمان نے سورہ بینہ کی آیت نمبر 5 میں یہ الفاظ دین القیمہ کو مرکب توصیفی خیال کیا ہے اسی لئے انہوں نے انکا ترجمہ موصوف صفت کی صورت میں کیا ہے یعنی دین قیم حالانکہ عربی کی معمولی واقفیت رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ یہاں مرکب توصیفی نہیں ہے بلکہ مرکب اضافی ہے اسی لئے القیمہ پر کسرہ یعنی زیر ہے۔ اور القیمہ کا موصوف حذف ہے جو کتب ہے جس کا ذکر اسی سورت میں کچھ پہلے ہوا ہے یعنی کتب قیمہ۔ لہٰذا عبارت یوں بنتی ہے ذٰلِکَ دِیۡنُ الۡکُتُبِ الۡقَیِّمَۃِ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ یہ کتب قیمہ کا طریقہ ہے یعنی یکسو ہو کر اور اللہ کے لئے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کرنا (جس کے دو بڑے ستون اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہیں) کتب قیمہ کا

طریقہ ہے۔ یہ بات ہم نے اپنی طرف سے نہیں گھڑی بلکہ یہی مضمون قرآن پاک میں ایک اور مقام پر ذکر ہوا ہے سورہ شوری کی آیت نمبر 13 ہے۔

شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا وَّالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَمَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ مُوۡسٰی وَعِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ۔

راہ ڈال دی تمہارے لئے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا تھا ہم نے تیری طرف اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ قائم رکھو دین کو۔

اس آیت میں دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے ریاست یا ایسا نظام قائم کرنا مراد نہیں ہے جو مرکزی اتھارٹی کے گرد گھومتا ہو اور حکومت واقتدار کا تقاضا کرتا ہو۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو ایک مثالی معاشرہ اور نظام قائم کرنے کا حکم دیں اور رسول اس حکم کو پورا نہ کریں اور یہ اس طرح کہ خود قرآن پاک کی شہادت کے مطابق حضرت نوح علیہ السلام کی قوم غرق ہوئی اور صرف چند لوگ بچے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر بیابان میں پھرتے رہے اور اسی حالت میں ان کی وفات ہوئی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر تو بس چند گنے چنے لوگ اسلام لائے اور وہ کوئی مثالی معاشرہ یا نظام قائم نہ کر سکے۔

بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ دین کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے اور ابتداء کوشش سے ہوتی ہے لہٰذا ان رسولوں کی کوشش اسی حکم کو پورا کرنے کے لئے تھی۔ اور گویا حکم میں ان سے مطالبہ بھی یہی تھا کہ تم کوشش کرو۔ جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس طرح کی تاویل غیر معقول ہے۔ اللہ تعالیٰ جو ہر چیز سے باخبر ہیں وہ غیر مناسب موقع پر ایسا حکم کیونکر دیں گے؟ ابتداء میں تو تبلیغ اور انذار کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور جب اس تبلیغ و انذار کے نتیجے میں افراد کی ایک کافی تعداد مہیا ہو جاتی ہے اور معاشرہ اور نظام قائم ہونے کی بنیادیں پڑ جاتی ہیں اس وقت اس سے متعلق اصول وضوابط اور احکام دئے جاتے ہیں۔

1- غرض حضرت نوح اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کو دین قائم کرنے کا

حکم دیا گیا اور انہوں نے یقیناً اس پر پورا عمل کیا تو معلوم ہوا کہ یہاں دین سے مراد عقائد اور عبادات اور اخلاق حسنہ کی تحصیل ہے۔ تو یہ کتب قیمہ کا دین ہوا۔ اور کتب قیمہ کا خلاصہ قرآن پاک کے اوراق میں بھی ذکر ہوا اس لئے فرمایا:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ۔ (سورة بينه 3)

اللہ کا ایک رسول پڑھتا ہے پاک ورق اس میں لکھی ہیں مضبوط کتابیں۔

2- مثالی معاشرہ اور نظام قائم کرنے کے لئے کسی علاقے میں حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ اس کا ذکر بھی قرآن پاک میں ہے فرمایا:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ۔

(سورة حج: 61)

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں زمین میں تو وہ قائم کریں صلوٰۃ کو اور ادا کریں زکوٰۃ کو۔

لیکن حکومت کا بالفعل قائم ہو جانا یہ محض اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اسی لئے اس آیت میں قدرت وحکومت دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور امر واقع بھی ایسا ہی ہے کیونکہ بسا اوقات کوشش کے باوجود مطلوبہ نتائج نہیں نکلتے۔

ڈاکٹر قمر زمان کی دوسری غلطی

سورۃ بینہ کی آیت نمبر 5 میں ہے۔

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ اس کا ترجمہ ڈاکٹر قمر زمان نے یوں کیا ہے ''اور انہیں تو صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ اللہ کی عبدیت اختیار کئے رکھیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر قمر زمان نے لِيَعْبُدُوْا کا ترجمہ عبدیت یعنی خدمت اور غلامی کے ساتھ کیا ہے۔ ڈاکٹر قمر زمان صاحب کی پہلی غلطی کے تحت ہم نے جو تفصیل ذکر کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ عبدیت کے ساتھ ترجمہ کر کے ڈاکٹر قمر زمان نے فاش غلطی کی اور اس کا صحیح ترجمہ عبادت ہے عبدیت نہیں اور عبادت چونکہ ہر شخص کی قدرت میں ہے اور کسی نظام

اور حکومت کی محتاج نہیں اس لئے فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ (سورہ ذاریات 56)

اور میں نے نہیں پیدا کیا جن کو اور آدمی کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں۔

اسی طرح سورۃ مریم آیت نمبر 25 میں فرمایا: فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ۔ (سو اس کی بندگی کر اور قائم رہ اس کی عبادت پر) اس آیت میں واضح طور پر عبد سے عبادت مراد ہونے کی نشاندہی کر دی کہ عبادت کر کے چھوڑنا نہیں بلکہ اس پر قائم بھی رہنا ہے۔

ڈاکٹر قمر زمان کی تیسری غلطی

ڈاکٹر قمر زمان صاحب نے عبادت کو ذریعہ بتایا ہے اور مثالی معاشرہ و نظام قائم کرنے کو اصل مقصود کہا ہے۔ ہماری مذکورہ بالا وضاحتوں سے معلوم ہوا کہ اصل معاملہ اس کے برعکس ہے اور عبادت رب اصل مقصود ہے جب کہ معاشرہ و نظام کا قیام عبادات کی پرامن ادائیگی کے لئے معاون ہوتا ہے۔

اس بات کی تفصیل یہ ہے کہ عبادت کہتے ہیں:

اقصى غاية التذلل ولذلك لا تستعمل الا فى الخضوع لله تعالى۔

انتہائی درجے کی ذلت و عاجزی کے اظہار کو (اور چونکہ اس کی مستحق صرف وہ ذات ہے جو غایت درجہ فضیلت وکمال والی ہے) لہٰذا عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کی جانے والی عاجزی کو کہتے ہیں۔

بعض حضرات نے اس کے ساتھ محبت کی آمیزش کا بھی ذکر کیا ہے جس کا سبب یا تو احسان ہوتا ہے یا کسی کی خوبیاں (یعنی صفات کمال) ہوتی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ میں یہ دونوں ہی باتیں پائی جاتی ہیں لہٰذا عبادت کا مطلب ہوا محبت اور شکر کے جذبے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی درجے کی ذلت و عاجزی کو اختیار کرنا۔ اس کے برخلاف عبدیت کا مطلب فقط اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بڑا اور حاکم جانتے ہوئے اس کے حکموں کو

پورا کرنا۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے محبت اور شکر کے جذبات کا ہونا ضروری نہیں۔

قرآن پاک میں بھی احسان وانعامات پر عبادت کو متفرع کیا جو اس بات کی دلیل ہے کہ شکر واحسان مندی کے طور پر بندگی ہو اور وہ صرف عبادت میں ہوتی ہے خدمت و غلامی میں نہیں۔

1- يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ۔ (سورة بقره: 21-22)

اے لوگوں عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ جس نے بنایا تمہارے واسطے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے تمہارے کھانے کے واسطے۔

2- وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِىْ فَطَرَنِىْ (سورة يٰسين 23)

اور مجھ کو کیا ہوا کہ میں عبادت نہ کروں اس کی جس نے مجھے بنایا۔

اللہ تعالیٰ تمام صفات کمال سے متصف ہیں اور اپنے بندوں پر ان کی نعمتیں اور احسان بے شمار ہیں اور عقل کا فیصلہ ہے کہ نعمتیں دینے والے کا شکر ادا کیا جائے اور قابل تعریف صفات سے متصف کی تعظیم کی جائے۔ اللہ کے شکر و تعظیم کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔ اور چونکہ نعمتیں ہر آن ہیں لہٰذا تعظیم بھی ہر آن کی جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے محض ہماری عقل پر نہیں چھوڑا بلکہ عبادت کے طریقے خود بتائے۔

لیکن شکر و امتنان اور تعظیم کے جذبات کے ساتھ عبادت کے افعال کی کمال درجے کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ دل و دماغ کو سکون واطمینان حاصل ہو۔ ذہنی انتشار اور مختلف قسم کی پریشانیاں خلل کا موجب بنتی ہیں۔ اور انتشار اور پریشانیاں آپس کے جھگڑوں سے اور آپس کی خیر خواہی کو ترک کرنے سے جنم لیتی ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ نے معاملات اور حقوق سے متعلق احکامات دیئے تا کہ ان پر عمل کر کے جھگڑوں اور حق تلفی

سے بچاؤ ہو سکے۔ اور لوگ باہمی معاملات اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق کریں اور آپس میں حق تلفی اور ظلم نہ کریں اس کے لئے حکومت کی ضرورت ہوئی تا کہ وہ ظالموں کو ظلم سے روکے اور لوگوں کو اللہ کے احکامات کا پابند کرے۔

غرض عبادات اور معاملات وغیرہ سب ہی دین کے احکامات ہیں لیکن ان میں عبادات کو اصلی اور مرکزی حیثیت حاصل ہے اور معاملات وغیرہ اس کے گرد گھومتے ہیں۔

ڈاکٹر قمر زمان صاحب ذوق لطیف اور ذوق جمال سے بھی عاری ہیں اس لئے ان کو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان صرف حاکم و محکوم کا تعلق نظر آتا ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں جابجا اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات اور شانوں کے ذریعے ان کی معرفت کا ذکر ہے اور ایک کی دوسرے کے ساتھ محبت کا ذکر بھی ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران: 31)

آپ کہہ دیجئے اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو تا کہ محبت کرے تم سے اللہ۔

عبادت کی اسی اہمیت کی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں عبادت سے اعراض کرنے والوں کو سخت وعید سنائی۔

1- اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِىْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ۔ (سورة غافر 60)

بے شک جو لوگ تکبر کرتے ہیں میری عبادت سے عنقریب وہ جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل ہو کر۔

2- وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا۔ (سورة نساء: 172)۔

اور جو ئی کوئی عار کرے اللہ کی عبادت سے اور تکبر کرے سو وہ جمع کرے گا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا۔

تیسری غلطی: جِنّات کا انکار کرنا

پرویز کہتے ہیں

''قرآن کریم میں ہے کہ جب کرہ ارض پر ہنوز انسانوں کی آبادی نہیں ہوئی تھی تو اس میں جو مخلوق یہاں بستی تھی اس میں حرارت برداشت کرنے کی قوت اور صلاحیت زیادہ تھی۔ اس کے بعد وہ مخلوق ختم (Extinct) ہوگئی اور اس کا جانشین انسان ہوا۔

جن وہ قبائل تھے جو جنگلوں اور صحراؤں میں جگہ جگہ پھرتے رہتے تھے اور اس طرح شہر والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ انہیں خانہ بدوش قبائل کہا جاتا ہے......عربوں میں یہ صحرانشین قبائل بہت زیادہ تھے (انہیں بدو یا اعراب کہا جاتا تھا) چونکہ قرآن کا پیغام شہریوں اور صحرانشینوں سب کی طرف تھا اس لئے اس نے جن وانس دونوں گروہوں کو مخاطب کیا ہے۔

سورۃ جن اور سورۃ احقاف سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو جن رسول اللہ ﷺ کے پاس قرآن سننے کے لئے آئے تھے وہ انسان ہی تھے۔

سورہ نمل میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس جن وانس کے لشکر تھے۔ ان جنوں کے متعلق سورۃ سبا میں ہے کہ وہ ہیکل کی تعمیر کا کام کرتے تھے، مجسمے تراشتے تھے، لگن اور دیگیں بناتے تھے، سمندروں میں غوطہ خوری سے موتی نکالتے تھے، انہیں زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن میں جن وانس سے مراد وحشی اور متمدن انسان ہیں۔ انس جو مانوس تھے اور جن جو وحشی اور غیر مہذب قبائل جنگلوں اور صحراؤں میں رہتے تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے درباریوں میں سے ایک کے لئے **عفریت من الجن** آیا ہے یعنی وحشی اور پہاڑی قبائل میں سے ایک مضبوط، قوی ہیکل اور

چست و چالاک آدمی۔''

پرویز کے ان اقتباسات کا حاصل یہ ہے کہ جنات انسان سے علیحدہ ایک مخلوق تھی جو انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے بعد قرآن میں جن کو جن کہا گیا ہے ان سے مراد جنگلوں اور صحراؤں میں رہنے والے غیر مہذب اور غیر متمدن انسان ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ

ہم متعلقہ آیتیں لکھتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ پرویز صاحب کی یہ باتیں قرآن کے بالکل خلاف ہیں:

1- قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَؤُا أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِهَا قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ قَالَ عِفْرِيتٌ مِنَ الْجِنِّ أَنَا آتِيكَ بِهِ قَبْلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ مَقَامِكَ وَإِنِّي عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ أَمِينٌ۔

(سورہ نمل: 38,39)

(سلیمان علیہ السلام نے) کہا اے دربار والو تم میں سے کون اس (ملکہ سبا) کا تخت میرے پاس لا سکتا ہے پیشتر اس کے کہ وہ (یعنی ملکہ سبا اور اس کے ہمراہی) میرے پاس فرماں بردار ہو کر پہنچیں۔ جنوں میں سے ایک (قوی ہیکل) دیو نے کہا میں اس کو آپ کے پاس آپ کے اپنی جگہ سے اٹھنے سے پہلے لے آؤں گا اور میں (اس کام پر) زور آور اور امانت دار ہوں۔

بھلا بتائیے ایک انسان خواہ وہ کتنا ہی چست و چالاک ہو اور کتنا ہی زور آور ہو محض دو چار گھنٹوں میں ایک دور دراز کے ملک میں جا کر وہاں کے شاہی محل سے بلا مزاحمت شاہی تخت اٹھا کر لے آئے یہ کیسے ممکن ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ وہ تخت اتنا وزنی اور اتنا لمبا چوڑا ہو کہ ایک انسان کی انتہائی قوت کے تحمل سے باہر ہو۔

2- وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَأَسَلْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَمَنْ يَزِغْ مِنْهُمْ عَنْ أَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ

عَذَابِ السَّعِيۡرِ يَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَاۤءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ وَتَمَاثِيۡلَ وَجِفَانٍ كَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ رّٰسِيٰتٍ اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِىَ الشَّكُوۡرُ فَلَمَّا قَضَيۡنَا عَلَيۡهِ الۡمَوۡتَ مَا دَلَّهُمۡ عَلٰى مَوۡتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الۡاَرۡضِ تَاۡكُلُ مِنۡسَاَتَهٗ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الۡجِنُّ اَنۡ لَّوۡ كَانُوۡا يَعۡلَمُوۡنَ الۡغَيۡبَ مَا لَبِثُوۡا فِى الۡعَذَابِ الۡمُهِيۡنِ۔ (سورہ سبا **12** تا **14**)

اور مسخر کر دیا ہم نے سلیمان کے لئے ہوا کو۔ ہوا کی صبح کی منزل ایک مہینے کی اور شام کی منزل ایک مہینے کی اور بہا دیا ہم نے اس کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ۔ اور جنوں میں کتنے لوگ تھے جو محنت کرتے تھے اس کے سامنے اس کے رب کے حکم سے اور جو ان میں سے سرکشی کرے ہمارے حکم سے تو ہم اس کو چکھائیں آگ کا عذاب۔ وہ جن بناتے ہیں سلیمان کے لئے جو وہ چاہتا ہے قلعے اور تصویریں اور تالاب کی طرح کے (بڑے بڑے) تسلے اور (چولہوں پر) جمی ہوئی دیگیں۔ اے آل داؤد (نیک) عمل کرو احسان مانتے ہوئے اور میرے بندوں میں سے تھوڑے ہی ہیں احسان ماننے والے۔ پھر جب ہم نے مقرر کیا سلیمان پر موت کو تو نہیں رہنمائی کی اس کی موت پر مگر زمین کے کیڑے (دیمک) نے جو کھاتا رہا سلیمان کا عصا (جس کے سہارے وہ اپنی موت کے بعد بھی اپنی سابقہ ہیئت پر قائم رہے۔ جب عصا دیمک زدہ ہو کر گرا پھر (سلیمان بھی گرے اور) جب سلیمان گرے تب جنوں پر واضح ہو گیا کہ اگر وہ غیب کو جانتے ہوتے (تو سلیمان علیہ السلام کی موت کو بھی جان لیتے اور) نہ رہتے رسوا کن عذاب میں۔

1- بھلا بتایئے کیا خانہ بدوش اور گنوار قسم کے لوگوں کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھنا اور آگ سے جلانا کیا جائز تھا۔ کیا ان سے بیگار لی جا رہی تھی؟ اگر اجرت پر کام لیا جا رہا تھا تو سرکشی پر ان کو فارغ کر دیا جاتا ایسی سخت سزا دینا کس قانون سے جائز ہے؟

2- پھر ایسی صنعت کا گنواروں سے کیا تعلق؟ گنوار مزدوری تو کر سکتے ہیں وہ معمار اور فنکار کیسے بن گئے۔ ایسے کام کو شہری لوگ زیادہ بہتر کر سکتے ہیں۔

3- گنواروں کو علم غیب سے کیا تعلق تھا

4- کام یا مزدوری کو رسوا کن عذاب کہا گیا۔ کیا وہ گنوار جنگی قیدی تھے کہ جن کے لئے وہ مزدوری رسوا کن عذاب تھی۔

غرض یہاں جنوں سے خانہ بدوش اور گنوار قسم کے لوگ مراد لئے جائیں تو مذکورہ بالا اشکالات پیش آتے ہیں جن کا کوئی حل نہیں ملتا۔

پھر لامحالہ یہی کہا جائے گا کہ یہاں جنوں سے مراد انسان سے الگ ایک مخلوق ہے جو آتشی الاصل ہے اس کے لئے آگ سے جلانے کی سزا غیر معمولی نہیں اور ممکن ہے کہ ان کی کسی شرارت پر ان کو سزا میں قید کیا گیا ہو اور بیگار کے طور پر ان سے یہ بڑے بڑے کام لئے جا رہے ہوں۔

قُلۡ اُوۡحِىَ اِلَىَّ اَنَّهُ اسۡتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الۡجِنِّ فَقَالُوۡۤا اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا يَّهۡدِىۡۤ اِلَى الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ وَلَنۡ نُّشۡرِكَ بِرَبِّنَاۤ اَحَدًا وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا وَّ اَنَّهٗ كَانَ يَقُوۡلُ سَفِيۡهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا وَّ اَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ تَقُوۡلَ الۡاِنۡسُ وَالۡجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الۡاِنۡسِ يَعُوۡذُوۡنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الۡجِنِّ فَزَادُوۡهُمۡ رَهَقًا وَّاَنَّهُمۡ ظَنُّوۡا كَمَا ظَنَنۡتُمۡ اَنۡ لَّنۡ يَّبۡعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا وَّاَنَّا لَمَسۡنَا السَّمَآءَ فَوَجَدۡنٰهَا مُلِئَتۡ حَرَسًا شَدِيۡدًا وَّشُهُبًا وَّ اَنَّا كُنَّا نَقۡعُدُ مِنۡهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمۡعِ فَمَنۡ يَّسۡتَمِعِ الۡاٰنَ يَجِدۡ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا وَّاَنَّا لَا نَدۡرِىۡۤ اَشَرٌّ اُرِيۡدَ بِمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ اَمۡ اَرَادَ بِهِمۡ رَبُّهُمۡ رَشَدًا وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنَّا دُوۡنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا وَّاَنَّا ظَنَنَّاۤ اَنۡ لَّنۡ نُّعۡجِزَ اللّٰهَ فِى الۡاَرۡضِ وَلَنۡ نُّعۡجِزَهٗ هَرَبًا وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعۡنَا الۡهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ فَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخۡسًا وَّلَا رَهَقًا۔ (سورہ جن **13-1**)

آپ کہہ دیجئے میری طرف وحی کی گئی ہے کہ (اس قرآن کو) سنا جنوں کی ایک جماعت نے پھر کہا ہم نے سنا ایک عجیب قرآن (جو کہ) دکھاتا ہے

> نیک راہ تو ہم اس پر ایمان لائے اور ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں گے اور یہ کہ ہمارے رب کی شان اونچی ہے۔ اس (یعنی ہمارے رب) نے (اپنے لئے) نہ تو بیوی رکھی ہے اور نہ ہی کوئی بچہ رکھا ہے اور یہ کہ ہم میں سے بیوقوف لوگ اللہ پر بڑھا چڑھا کر باتیں کرتے تھے حالانکہ ہم خیال کرتے تھے کہ انسان اور جن اللہ پر ہرگز جھوٹ نہ بولیں گے اور یہ کہ انسانوں میں سے کتنے ہی لوگ پناہ لیتے تھے جنوں میں سے کتنے ہی لوگوں کی (اور اس طرح) انسانوں نے جنوں کو سرکشی میں بڑھا دیا۔ اور یہ کہ جیسے تم (جن) خیال کرتے ہو ایسے ہی انسان بھی خیال کرتے تھے (کہ) اللہ ہرگز کسی کو بھی قبروں سے) نہ اٹھائے گا۔ اور یہ کہ ہم نے ٹٹولا آسمان کو تو ہم نے اس کو سخت چوکیداروں اور انگاروں سے بھرا ہوا پایا۔ اور یہ کہ ہم (فرشتوں کی بات) سننے کے لئے ٹھکانوں میں بیٹھا کرتے تھے لیکن اب (موجودہ زمانے میں ہم یہ تبدیلی دیکھ رہے ہیں کہ) جو کوئی سننا چاہے تو وہ اپنے لئے گھات لگایا ہوا انگارہ پاتا ہے۔ اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ زمین پر رہنے والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے رب نے ان کے ساتھ ہدایت کا ارادہ کیا ہے اور یہ کہ ہم (جنوں) میں نیک لوگ بھی ہیں اور ہم میں اس کے علاوہ (یعنی برے لوگ) بھی ہیں۔ ہم کئی راہوں پر پھٹے ہوئے تھے۔ اور یہ کہ ہم نے خیال کر لیا ہے کہ اللہ کو ہرگز عاجز نہیں کر سکتے زمین میں (چھپ کر) اور نہ ہی ہم اس کو عاجز کر سکتے ہیں بھاگ کر۔ اور یہ کہ جب ہم نے ہدایت کی بات سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے اور جو کوئی ایمان لائے اپنے رب پر تو وہ نہ نقصان سے ڈرے گا اور نہ زبردستی سے۔

ان آیتوں کا مضمون اس بات پر صریح دلیل ہے کہ جنوں سے مراد خانہ بدوش اور گنوار انسان نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ کلام انتہائی سمجھداری کا تھا۔ کسی جاہل خانہ بدوش کا کلام ایسا نہیں ہوتا پھر ان آیتوں میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں۔

1- آسمانوں پر انہوں نے سخت چوکیدار دیکھے۔ اگر ان آسمانی چوکیداروں کو فرشتے کہا جائے تو کیا استبعاد ہے؟

2- جن آسمان پر فرشتوں کی باتیں سن لیتے تھے۔

3- قرآن کے نزول کے زمانہ میں فرشتوں کی بات سننے کی کوشش کرنے پر آگ کا انگارہ جا لگتا تھا۔

چوتھی غلطی: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ماننا

پرویز اور محمد شیخ اور ان جیسے دوسرے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے پرویز لکھتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہتے ہیں کہ یہ (مخالفین) اس قسم کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ تجھے گرفتار کر کے سولی پر لٹکا دیں۔ لیکن ان کے خلاف ہم بھی ایک تدبیر کر رہے ہیں اور ہماری تدبیر ان کی تدبیروں سے یقیناً بہتر ہے۔ میری (یعنی اللہ کی) تدبیر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ لوگ تمہیں نہ گرفتار کر سکیں گے نہ صلیب دے سکیں گے بلکہ تم اپنی طبعی موت مرو گے۔ (اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ) یہ لوگ تمہیں صلیب دے کر دنیا کو بتانا چاہتے ہیں کہ تم (معاذ اللہ) لعنتی موت مرے۔ ہم تیرے مدارج کو بلند کریں گے۔ (وَرَافِعُكَ اِلَیَّ) اور یہ اس طرح سے ہوگا کہ ہم تجھے ان مخالفین کی دستبرد سے دور لے جائیں گے (وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا) چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ قبل اس کے کہ یہودی حضرت مسیحؑ پر ہاتھ ڈالتے آپ ایک سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق وہاں سے ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تھی خدا کی تدبیر جو کامیاب ہوئی۔
>
> اسی طرح سورہ مائدہ میں ہے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ہے فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو ان پر تو ہی نگہبان تھا۔“

محمد شیخ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وفات پا جانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وفات پا جانے کا قول کرنا اور اس کو قرآن پاک سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا بالکل غلط ہے جس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں۔

1- سورہ مائدہ میں ہے:

اِذۡ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیۡسَی بۡنَ مَرۡیَمَ ءَ اَنۡتَ قُلۡتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوۡنِیۡ وَ اُمِّیَ اِلٰـہَیۡنِ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ قَالَ سُبۡحٰنَکَ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اَقُوۡلَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِحَقٍّ اِنۡ کُنۡتُ قُلۡتُہٗ فَقَدۡ عَلِمۡتَہٗ تَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِیۡ وَلَاۤ اَعۡلَمُ مَا فِیۡ نَفۡسِکَ اِنَّکَ اَنۡتَ عَلَّامُ الۡغُیُوۡبِ o مَا قُلۡتُ لَہُمۡ اِلَّا مَاۤ اَمَرۡتَنِیۡ بِہٖۤ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیۡ وَ رَبَّکُمۡ وَ کُنۡتُ عَلَیۡہِمۡ شَہِیۡدًا مَّا دُمۡتُ فِیۡہِمۡ فَلَمَّا تَوَفَّیۡتَنِیۡ کُنۡتَ اَنۡتَ الرَّقِیۡبَ عَلَیۡہِمۡ وَ اَنۡتَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ۔

جب کہے گا اللہ (قیامت کے دن) اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو۔ (جواب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کہیں گے تو پاک ہے مجھے تو یہ لائق نہیں کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں ہے۔ اگر میں نے یہ کہا ہوگا کہ تو تجھ کو ضرور اس کا علم ہوگا۔ تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے بے شک تو ہی چھپی باتوں کو جاننے والا ہے۔ میں نے تو ان کو صرف وہی بات کہی جس کا تو نے مجھے حکم دیا کہ عبادت کرو اللہ کی جو میرا رب ہے اور تمہارا رب ہے اور جب تک میں ان میں رہا میں ان کے (کے حالات) پر خبردار تھا پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو (پھر) تو ہی ان کی خبر رکھنے والا تھا اور تو ہی ہر چیز سے خبردار ہے۔

اگر خط کشیدہ عبارت کا ترجمہ وہ کریں جو پرویز نے کیا ہے یعنی پھر جب تو نے مجھے وفات دے دی تو مطلب صحیح نہیں رہتا کیونکہ پرویز کے بقول یہود کی تدبیر کے

وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام وہاں سے ہجرت کر گئے اور بعد میں اپنی طبعی موت مرے۔ ہجرت کے وقت سے طبعی موت پانے تک ظاہر ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام حالات کی نگرانی نہیں کر پائے لیکن بجائے اس کے کہ وہ یہ فرماتے کہ پھر جب میں ہجرت کر گیا تو ہی ان کی خبر رکھنے والا تھا پرویز صاحب کے بقول وہ یہ فرمائیں کہ پھر جب تو نے مجھ کو وفات دے دی تو ہی ان کی خبر رکھنے والا تھا تو یہ بات واقعہ سے مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ کہنا کہ رسول کی بات واقعہ کے مطابق نہیں تھی قابل تسلیم نہیں لہٰذا یہی ماننا پڑے گا کہ پرویز وغیرہ نے جو ترجمہ کیا وہی غلط ہے اور صحیح ترجمہ یہ ہے کہ پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا (یعنی زندہ آسمان کی طرف) تو ہی ان کی خبر رکھنے والا تھا۔

2- وَاِنۡ مِّنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤۡمِنَنَّ بِہٖ قَبۡلَ مَوۡتِہٖ۔ (سورہ نساء: **159**)

اور نہیں کوئی اہل کتاب (یعنی یہود اور عیسائی) مگر یہ کہ وہ ایمان لائے گا عیسیٰ علیہ السلام پر ان کی موت سے پہلے۔

اگر مان لیا جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو چکی ہے تو قرآن کی یہ بات تو پوری نہیں ہوئی اور قرآن کی کوئی بات پوری نہ ہو یہ ممکن نہیں لہٰذا یہی ماننا پڑے گا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی اور ان کی وفات کے وقت کوئی یہودی یا عیسائی ایسا نہ ہوگا جس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر معتبر ایمان حاصل نہ ہوا اور وہ مسلمان نہ ہو چکا ہو۔

3- وَمَا قَتَلُوۡہُ یَقِیۡنًا بَلۡ رَّفَعَہُ اللّٰہُ اِلَیۡہِ۔ (سورہ نساء: **157**)

اور یہود نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو اٹھا لیا اپنی (بنائی ہوئی بلندی کی) طرف (جو کہ زمین کے مقابلہ میں آسمان کو حاصل ہے)۔

پرویز نے اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے۔

''اللہ نے ان کے مدارج بلند کر دیئے اور اس طرح اپنا مقرب بنالیا۔''

اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ

ورنہ اگر رَفَعَ کے معنی جسمانی طور پر اوپر اٹھا لینے کے لئے جائیں تو اِلَیہ (خدا کی طرف) کے لفظ سے یہ ماننا پڑے گا کہ خدا کسی ایک مقام پر ہے رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ کے معنی یہی ہیں کہ اللہ نے اس کے درجات بلند کر کے اسے اپنا مقرب بنالیا۔

پرویز نے جو وجہ ذکر کی ہے وہ اس معنی سے جو ہم نے کیا ہے اپنا وزن کھو بیٹھتی ہے۔ کیونکہ جب ایک دوسرے ممکن معنی کا احتمال (Possibility) ہونا ظاہر ہو گیا تو ان کا استدلال جاتا رہا۔

4- حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنے علاقہ سے ہجرت کر جانا اور اپنی طبعی موت مرنا کسی بھی معتبر تاریخ میں نہیں ملتا۔ کسی قبر پر عیسیٰ لکھے ہونے سے اس کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہونے پر قطعی تو کیا ظنی دلیل بھی نہیں۔

5- پرویز کا بتایا ہوا معنی خود قرآن کے اسلوب سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جب الفاظ میں کوئی اور قرینہ موجود نہ ہو تو قرآن درجہ و مرتبہ میں بلندی کے لئے درجات یا مکان کے لفظ کی قید لگاتا ہے۔

وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ اور بلند کیا ان کے بعض کو درجوں میں

وَ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (سورہ مریم: 57) اور بلند کیا ان کو اونچے مرتبے میں

پھر مُتَوَفِّيْكَ کا ترجمہ وفات دینے میں قطعی نہیں ہے۔ خود قرآن پاک میں ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰى۔ (سورہ زمر: 42)

اللہ لے لیتا ہے جانوں (یعنی روحوں) کو (پرویز نے اس کا ترجمہ انسانی ذات سے کیا ہے) کو ان کی موت کے وقت اور جن جانوں کی موت نہیں آئی ان کو لے لیتا ہے۔ (یعنی قبض کر لیتا ہے) ان کی نیند میں پھر جن پر موت کا فیصلہ کر دیا ان کو روک لیتا ہے اور دوسری (روحیں جن کی موت نہیں آئی ان) کو چھوڑ دیتا ہے۔

اس آیت میں تَوَفّی کا مطلب روح کو لے لینا ہے تو مُتَوَفِّيْكَ سے وفات مراد لینا قطعی نہیں بلکہ پورا پورا لینا (یعنی روح و جسم دونوں کو لے لینا) بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔

پانچویں غلطی: نظریہ ارتقاء کو قرآن سے ثابت کرنا

پرویز لکھتے ہیں۔

سلسلہ کائنات کی ابتداء اور اس کے تدریجی مراحل کے متعلق قرآن کریم نے ایک اصولی نظام بیان کیا ہے جو اس بحث کا نقطہ ماسکہ ہے۔ ارشاد ہے:

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗٓ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

جب کسی سکیم کو بروئے کار لانا مقصود ہوتا ہے تو قانون مشیت کے مطابق زمین کی پستیوں سے اس کا آغاز ہوتا ہے پھر وہ سکیم اپنے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے اپنے مقام تکمیل کی طرف اٹھتی چلی جاتی ہے۔ یہ مراحل بڑے طویل المیعاد وقفوں میں طے ہوتے ہیں جن میں کا ایک وقفہ تمہارے حساب و شمار کی رو سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے۔

یہاں ان مراحل کے متعلق کہا ہے کہ وہ ہزار ہزار برس کے ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ کہا گیا ہے کہ یہ بعض صورتوں میں پچاس پچاس ہزار سال کے ہوتے ہیں۔

خدا کے اسی نظام ارتقاء کی رو سے اس نے کہا ہے کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا ہے۔ سورہ الانبیاء میں ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ اور ہم نے ہر جاندار شے کو پانی سے بنایا کیا یہ لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے۔

اس کے بعد اس نے ان تخلیقی مراحل کا ذکر کیا ہے جن میں سے گزر کر زندگی پیکر انسانی تک پہنچی۔ اس سلسلہ میں فرمایا:

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۔

اس نے انسانی تخلیق کی ابتداء مٹی سے کی۔

دوسری جگہ طین کی بجائے تراب کا لفظ آیا ہے۔ طین یا تراب غیر جاندار مادہ تھا۔ جب اس کے ساتھ پانی کی آمیزش ہوئی تو وہ طین لازب یعنی چپچپی مٹی بن گیا۔ سورہ صافات میں ہے کہ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ۔ قرآن نے اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ مٹی اور پانی کے امتزاج یعنی اس گارے کی صورت یہ نہیں تھی کہ اس میں مٹی زندگی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ اس ''مٹی کا خلاصہ'' پانی سے ملا تو اس سے زندگی کے اولین جرثومہ کی نمود ہوئی چنانچہ سورہ مومنون میں ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ اس آیت میں ''مٹی کے خلاصہ'' کے الفاظ بڑے غور طلب ہیں۔ ہم جب کوئی بیج زمین میں بوتے ہیں تو وہ ان اجزاء کو جن پر اس کی نشوونما کا مدار ہوتا ہے زمین سے کھینچ کر اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ انہی اجزاء (نمکیات، معدنیات وغیرہ) کو سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ یعنی مٹی کا خلاصہ کہا جائے گا۔ اس قسم کے مٹی کے خلاصہ سے حیات کا پہلا خلیہ (Cell) وجود میں آیا۔

قرآن کریم نے دیگر مقامات میں ایک اور حقیقت کی بھی وضاحت کی ہے۔ اس نے اشارۃً یہ بتایا ہے کہ پانی اور مٹی کے اس امتزاج کے ساتھ حرارت کی بھی ضرورت تھی لیکن ان عناصر ترکیبی میں ایک خاص توازن یا تناسب نہایت ضروری تھا۔ اگر وہ تناسب قائم نہ رہے تو وہ مٹی سوکھ کر ٹھیکری بن جائے۔ چنانچہ سورۃ الرحمٰن میں ہے خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ہم نے انسان کو خمیر اٹھے ہوئے گارے سے بنایا جس کی کیفیت یہ تھی کہ (اس میں اگر حرارت کی زیادتی ہو جائے تو) وہ سوکھ کر ٹھیکری کی طرح بجنے لگ جائے۔ لیکن ہم نے ان اجزاء میں ایسا تناسب قائم کیا کہ اس سے زندگی کا اولین جرثومہ وجود میں آ گیا۔'' اسے قرآن کریم نے ''نَفْسٍ وَّاحِدَہ'' کہہ کر پکارا ہے

یعنی ایسا خلیہ جس میں نر و مادہ کا امتیاز نہیں تھا۔ وہ واحد یعنی ایک (Unit) تھا۔ سورۃ الانعام میں ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ۔

خدا کی ذات وہ ہے جس نے تمہیں نفس واحدہ سے نشوونما دی۔ پھر تمہارے لئے مختلف منازل مقرر کیں کہ تم ایک وقت معین کے لئے ایک منزل میں ٹھہرو اور وہ منزل تمہیں اگلی منزل کے سپرد کرے۔ اس طرح تم ارتقاء کی مختلف منازل طے کرتے ہوئے پیکر انسانی میں پہنچے۔

انہی مراحل اور منازل کے متعلق دوسری جگہ کہا ہے کہ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ تم یقیناً ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتے ہوئے یہاں تک پہنچے اور اس کے بعد شاہراہ حیات پر اسی طرح آگے بڑھتے اور بلند ہوتے جاؤ گے۔'' ارتقائی منازل میں اسی تبدل وتحول کے متعلق دوسری جگہ کہا وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا اس نے تمہیں اس طرح پیدا کیا کہ تم طور طریقے بدلتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے۔

سب سے پہلے زندگی کے جس خلیہ کی نمود ہوئی اس میں نر و مادہ کی تمیز نہیں تھی۔ اس کے بعد یہ خلیہ جوش نمو سے پھٹ کر دو حصوں میں بٹ گیا۔ ان میں سے ایک حصہ نے نر کی شکل اختیار کی اور دوسرے نے مادہ کی۔ گویا یہ جوڑا اسی نفس واحدہ سے وجود میں آیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا۔

(سورہ: اعراف 189)

تمہارا نشوونما دینے والا وہی ہے جس نے تمہیں ایک نفس واحدہ سے پیدا کیا۔

ان تخلیقی مراحل کو طے کرتی ہوئی زندگی اس مرحلہ میں آ پہنچی جہاں افزائش نسل بذریعہ تناسل یعنی نطفہ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ عام اصطلاح میں اسے

درجہ حیوانات کہا جاتا ہے۔سورۃ السجدہ میں ہے۔

ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ۔ (سورہ سجدہ: 8)

''پھر اس کی (انسان کی) نسل کو کمزور سے پانی کے خلاصہ سے بنایا۔''

ہم کہتے ہیں۔

پرویز نے اس ایک فلسفہ کو اختیار کر کے کئی باتوں کی راہ ہموار کر لی ہے۔

i- ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو قرآن میں زبردستی گھسانے کی راہ۔

ii- حضرت آدم علیہ السلام کی متعین ہستی ہونے کا انکار کرنے کی راہ۔

iii- ملائکہ کا ذی حیات و ذی شعور ہستیاں ہونے کا انکار کرنے کی راہ۔

iv- ابلیس کے لئے موجود فی الخارج ہستی ہونے کے انکار کی راہ۔

پرویز نے آدم، ملائکہ اور ابلیس کے جو معانی بتائے ہیں اور تخلیق انسانی سے متعلق آیات کا جو مطلب کیا ہے یہ حقائق چونکہ ایسے نہیں کہ مرور زمانہ سے جن کے معانی و مطالب بدل جائیں اس لئے اس بات کی تحقیق ناگزیر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے ان سے کیا سمجھا تھا۔ اگر انہوں نے کچھ اور سمجھا تھا اور اب پرویز نے کچھ اور بتایا ہے تو یہ الحاد فی الآیات ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يُلۡحِدُوۡنَ فِىۡۤ اٰيٰتِنَا لَا يَخۡفَوۡنَ عَلَيۡنَا۔(سورہ فُصِّلَتۡ: 40)

جو لوگ ہماری آیتوں میں الحاد کرتے ہیں (یعنی ان کا مطلب بگاڑتے ہیں) وہ ہم پر مخفی نہیں ہیں۔

آگے ہم قرآنی دلائل سے پرویز کی بات کے مخالف قرآن ہونے کو ذکر کرتے ہیں

ڈارون کا نظریہ ارتقاء غیر قرآنی فکر ہے

1- تخلیق ایک تکوینی اور واقعاتی چیز ہے جو ایک خاص طریقے سے واقع ہوئی۔ اس میں یہ احتمال ہی نہیں کہ اس سے ہٹ کر کسی اور صورت اور طریقے کو فرض کیا جا سکے۔ قرآن پاک کی انہی آیات سے تیرہ چودہ صدیوں تک مسلمان کیا سمجھتے

رہے۔خود پرویز کے بقول ہمارے ہاں جو عام تصور ہے کہ خدا نے پہلے پہل مٹی کا ایک پتلا بنایا اور اس میں روح پھونک کر اسے انسانی شکل عطا کر دی۔'' اگر یہ تصور غلط تھا جیسا کہ پرویز نے لکھا کہ ''یہ تصور قرآنی نہیں یہودیوں کے ہاں سے مستعار لیا ہوا ہے''۔تو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کا تو کم از کم یہ نظریہ نہ ہوگا۔ ان کی دی ہوئی فکر ہم تک کیوں منتقل نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی لفظی و معنوی حفاظت کا ذمہ لیا ہے پھر تیرہ چودہ صدیوں تک اس کی معنوی حفاظت کیوں نہیں ہوئی۔ معتزلہ فرقہ بھی پیدا ہوا جو عقل کا علمبردار تھا اور حدیثوں پر عام طور سے اعتراض کرتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی انگلی پکڑ کر ان کو صحیح بات کیوں نہیں سمجھائی حالانکہ پرویز کا کہنا ہے کہ ''انسانی تخلیق کے متعلق قرآن کریم سے جو اشارات ملتے ہیں وہ ہماری فکر کا رخ نظریہ ارتقاء کی طرف ہی موڑتے ہیں''۔

(مطالب الفرقان ص 290 ج 1)

پھر جب ڈارون کا نظریہ ارتقاء سامنے آیا جس کی حیثیت محض ایک قیاس آرائی (Speculation) سے زیادہ نہیں اس وقت پرویز کے کہنے کے مطابق قرآن کی بات کی اصل حقیقت سمجھ میں آئی۔ اگر ڈارون یہ نظریہ پیش نہ کرتا تو شاید پرویز وغیرہ لوگ بھی اب تک غلط فکر میں مبتلا رہتے۔

2- پرویز کے بقول'' قرآن کریم سے جو اشارات ملتے ہیں وہ ہماری فکر کا رخ نظریہ ارتقاء ہی کی طرف موڑتے ہیں''۔

ڈاکٹر قمر زمان، محمد شیخ اور پرویز جیسے لوگوں کے بلند بانگ دعووں کے برعکس کہ قرآن خود ہی بیان ہے اور قرآن کے کسی بھی مقام کو سمجھنے کے لئے حدیث کی ضرورت نہیں یہاں پرویز خود اقرار کر رہے ہیں کہ اس موضوع سے متعلق صرف اشارات ہیں جن کو بیان قطعاً نہیں کہا جا سکتا۔اب خدا کی طرف سے مزید بیان تو آنے سے رہا تو کیا یہ معقول طریقہ نہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی جانب سے دیے گئے بیان اور تعلیم کو تلاش کریں۔ آخر پرویز کی سمجھ کو قرآن نے ہمارے لئے حجت تو قرار نہیں دیا پھر ہم اسی کے

پابند کیوں ہوں۔

3- ارتقاء کے مجوز ماہرین حیاتیات کے نزدیک حیات کی ابتداء وائرس (Virus) سے ہوئی ہے۔ وائرس کی دریافت سے پہلے امیبا (Amoeba) کو ابتدائی مظہر سمجھا جاتا تھا اور پرویز وغیرہ نے بھی اپنی طرف سے قرآنی آیات کو اسی پر منطبق کیا ہے لیکن بعد کی تحقیقات نے اس کی تغلیط کر دی اور اب وائرس کی سادہ تر ترکیب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو یہ مقام دیا گیا ہے۔

پھر ماہرین حیاتیات کے نزدیک وائرس کا وجود مٹی، کیچڑ یا کھنکھناتی مٹی کا بھی محتاج نہیں ہے۔ ابتدائی گیس برق اور ماورائے بنفشی (Ultraviolet) روشنی کی موجودگی سے متحد ہو کر سادہ نامیاتی مرکبات میں تبدیل ہو گئی۔ جوں جوں زمین ٹھنڈی ہوتی گئی آبی بخارات جم کر تالاب، دریا اور سمندروں میں منتقل ہو گئے۔ سادہ نامیاتی مواد ان پانیوں میں لاکھوں سالوں میں جمع ہوتے گئے۔ اس یخنی کے مرکبات کے بارے میں توقع کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ایک دوسرے میں عمل کر کے مختلف کیمیائی چیزیں بنائی ہوں گی۔ حیات کی ابتدائی صورتوں یعنی وائرس نے ان سمندروں کے نامیاتی مرکبات کو اپنی زندگی اور تناسل کے لئے استعمال کیا ہوگا۔

4- قرآن پاک میں ہے۔

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِنْ مَاءٍ مَهِينٍ۔

اور انسان کی پیدائش گارے سے شروع کی۔ پھر اس کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی نطفہ سے بنایا۔

الانسان میں لام تعریف اگر جنس کا لیا جائے جیسا کہ پرویز کہتے ہیں تو مطلب یہ بنے گا کہ خدا نے جنس انسانی کی پیدائش گارے سے شروع کی پھر جنس انسان کی نسل کو نطفہ سے بنایا۔

یہ ترجمہ بالکل غلط اور عقل کے خلاف ہے کیونکہ جنس تو ایک عقلی مفہوم ہے اس کا گارے سے کیا تعلق اور اس کی نسل بھی نہیں ہوتی۔

اس آیت کا مطلب صرف اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب الانسان میں لام تعریف عہد کے لئے ہو اور اس سے مراد ایک شخص معین ہو جس کو خود تو گارے سے پیدا کیا گیا ہو پھر اس کی اولاد کو نطفہ سے پیدا کیا گیا ہو۔

5- يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً **(سورہ نساء: 1)**

اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اسی جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیئے۔

مِنْهُمَا میں ضمیر سے مراد نفس واحدہ اور اس کا زوج ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے۔ پرویز کا کہنا ہے کہ نفس واحدہ سے مراد امیبا ہے اور اس کے زوج سے مراد آئندہ کسی مرحلہ میں عمل تقسیم سے پیدا ہونے والا مادہ خلیہ ہے۔ پرویز کی یہ بات بالکل ہی غلط ہے کیونکہ ان دو سے تو مرد اور عورتیں نہیں بنائے گئے بلکہ ان سے تو محض یکخلیاتی یا کثیر الخلیاتی جاندار ہی بنائے گئے تھے۔

ہاں اگر نفس واحدہ سے آدم کے نام سے ایک متعین شخصیت مراد لی جائے اور ان سے اور ان کی زوجہ سے بہت مرد اور عورتیں پھیلائے تو مطلب صحیح بنتا ہے۔ اسی وجہ سے آیت میں یہ کہنا کہ اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا حقیقت پر محمول ہوگا مجاز پر نہیں اور کلام کو حقیقت پر محمول کرنا جب کہ وہ ممکن ہو ضروری ہے۔

پرویز کی بات اس اعتبار سے بھی غلط ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ نفس واحدہ سے اس کا جوڑا نکالا جب کہ پرویز کے مطابق نفس واحدہ سے جوڑا نہیں نکالا بلکہ پہلے نفس واحدہ کی تکثیر بغیر جوڑے کے ہوئی کیونکہ امیبا میں نر اور مادہ نہیں ہوتے۔ وہ تو ارتقاء کا خاصا حصہ گزرنے کے بعد نر و مادہ کی تمیز ہوئی۔ حیات کی ابتداء امیبا سے ماننے کے باوجود پھر بھی یہ کہنا کہ ایک جان سے اس کا جوڑا پیدا کیا گیا عقل سلیم اس کو قبول نہیں کرتی۔

6- پرویز کا سارا استدلال اور ان کی دلیل کا نقطہ ماسکہ اس تصور پر بھی پورا صادق آتا ہے جو آدم کے بارے میں تمام مسلمانوں میں چلا آیا ہے۔

تراب کا مطلب مٹی ہے۔ وہ بھی وہ جو منتخب کی ہوئی اور چنی ہوئی تھی۔ اس کا گارا بنایا گیا اور اس کو سُلٰلَةً مِنْ طِیْنٍ یعنی منتخب کردہ مٹی اور گارا کہا گیا۔ پھر اس گارے میں سڑاند پیدا ہوئی اور خمیر اٹھا جس کو حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ اور طِیْنٍ لَازِبٍ کہا گیا۔ پھر ہوا سے خشک ہو کر اور لو کی تپش سے پک کر کھنکھناتی مٹی بنی جس کو صَلْصَالٍ اور کَالْفَخَّارِ کہا گیا۔ پھر اس پر اور اطوار گزرے اور پھر اس قابل ہوئے کہ اس میں حیات پائی جائے۔ یہ مختلف مراحل کتنے عرصہ میں پورے ہوئے اس کی کسی نے بھی تحدید نہیں کی۔ ممکن ہے کہ اس کے ایک ایک مرحلہ میں ہزاروں سال گزرے ہوں اور ویسے تو اللہ تعالیٰ کو قدرت حاصل ہے کہ وہ سب کچھ ایک آن میں کر دیں۔

ہماری اس بات کے خلاف پرویز کے پاس کوئی قطعی اور پختہ قرآنی یا عقلی دلائل نہیں ہیں۔

غرض مذکورہ بالا تمام وجوہات سے معلوم ہوا کہ پرویز نے اس موضوع میں بھی قرآن وعقل دونوں کے اعتبار سے غلطی کی ہے۔ پرویز نے قرآن کے مطالعہ میں خود قرآن کے بتائے ہوئے اصولوں کو توڑا ہے تو آخر کس وجہ سے پرویز کے فہم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے مطابق تخلیق انسانی کو ماننا قرآن کے صریح خلاف ہے۔

چھٹی غلطی: حضرت آدم کی متعین ہستی ہونے کا انکار کرنا

پرویز کہتے ہیں کہ:

"آدم سے مراد کوئی خاص متعین فرد انسان نہیں بلکہ اس سے نوع انسانی مراد ہے جب اس کے افراد نے قدیم انفرادی زندگی کی جگہ قدیم قبائل کی شکل

میں پہلے پہل تمدنی زندگی شروع کی"۔

پرویز کی یہ بات مندرجہ ذیل وجوہ سے غلط ہے۔

1- انسانی تخلیق سے متعلق وہ تفصیل جو ابھی ہم نے ذکر کی۔

2- قرآن پاک میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔

اس آیت کا ترجمہ جو پرویز نے کیا ہے وہ یہ ہے۔

"یقیناً اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو ان کی ہم عصر اقوام پر فضیلت دی"۔

اس سے قطع نظر کہ آدم نبی تھے یا نہیں تھے یہ آیت اس بارے میں صریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو بھی ان کی ہم عصر قوم پر فضیلت دی اور یہی بات اس بارے میں قطعی دلیل ہے کہ آدم کے نام سے ایک متعین خاص شخص تھے کیونکہ اگر آدم سے پرویز کے کہے کے مطابق نوع انسانی لی جائے تو آیت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ نوع کی ہم عصر قوم ماننا ایک فضول بات ہے۔

3- وَ اتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ لَئِنْ بَسَطْتَّ اِلَیَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ مَا اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِیَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ اِنِّیْ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓءَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِی الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِیْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ قَالَ يٰوَيْلَتٰى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ۔ (مائدہ: 31-27)

اور پڑھ ان پر آدم کے دو بیٹوں کی خبر۔ جب دونوں نے کچھ نیاز دی تو قبول کی گئی ایک کی اور نہیں قبول کی گئی دوسرے کی۔ دوسرے نے (پہلے سے)

کہا میں تجھے قتل کر دوں گا۔ پہلا بولا کہ اللہ محض قبول کرتا ہے پرہیزگاروں سے (اور اس کی نیاز قبول نہیں کرتا جو متعلقہ معاملہ میں خطا کار ہو) اگر تو اپنا ہاتھ میری طرف بڑھائے گا تا کہ مجھے قتل کرے تو میں تجھے قتل کرنے کے لئے اپنا ہاتھ تیری طرف بڑھانے والا نہیں۔ میں تو اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تو لوٹے میرے گناہ کے ساتھ اور اپنے گناہ کے ساتھ پھر ہو جا تو آگ والوں میں سے اور یہی ظالموں کی جزا ہے۔ اور اس کو اس کے نفس نے اپنے بھائی کے قتل پر راضی کیا پھر اس نے اس کو قتل کر دیا اور ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں سے۔ پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کریدتا تھا زمین کو تا کہ اس (قاتل) کو دکھائے کہ کیسے وہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپائے۔ (یہ دیکھ کر) قاتل بولا ہائے افسوس مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ میں اس کوے کی مثل ہی ہوتا کہ چھپاتا اپنے بھائی کی لاش کو پھر لگا پچھتانے۔

اس آیت میں ایک پورا حقیقی واقعہ ذکر ہے جس کو تمثیل اور ڈرامہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس واقعہ کے دو کردار خاص متعین آدمی تھے جو خاص متعین شخص آدم کے بیٹے تھے اور اس بات کی دلیل کہ یہ آدم وہی پہلے انسان تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے مٹی سے پیدا کیا تھا یہ ہے کہ جب ان میں سے ایک نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا تو اب اس کو کچھ علم نہیں تھا کہ اپنے مقتول بھائی کی لاش کا کیا کرے۔ ایسی صورت حال اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس سے پہلے کسی انسان کے مرنے کا واقعہ پیش نہ آیا ہو۔ اگر قبائلی دور کے کسی دو آدمیوں کے درمیان ایسا واقعہ پیش آیا ہو تو قاتل کو یہ تو یقیناً پتہ ہوتا کہ مقتول کو کیسے ٹھکانے لگانا ہے۔

ساتویں غلطی: ملائکہ کا ذی حیات و ذی شعور ہستیاں ہونے کا انکار کرنا

پرویز لکھتے ہیں:

''قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان کو اجزائے ایمان میں سے قرار دیا ہے (مثلاً 2/285) یعنی ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ

اللہ، کتب، رسل، آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ ملائکہ پر بھی ایمان لائے۔ سوال یہ ہے کہ ملائکہ پر ایمان کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ ملائکہ کے متعلق وہ تصور رکھا جائے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور انہیں وہی پوزیشن دی جائے جو قرآن نے ان کے لئے متعین کی ہے۔ ملائکہ کے متعلق قرآن میں ہے کہ انہوں نے آدم کو سجدہ کیا (2/43) یعنی وہ آدم کے سامنے جھک گئے۔ اور آدم سے مراد خود آدمی یا نوع انسان) ہے لہٰذا ملائکہ کے آدم کے سامنے جھکنے سے مراد یہ ہے کہ یہ قوتیں وہ ہیں جنہیں انسان مسخر کر سکتا ہے۔ انہیں انسان کے سامنے جھکا ہوا رہنا چاہئے۔ کائنات کی جو قوتیں ابھی تک ہمارے علم میں نہیں آئیں انہیں چھوڑیئے۔ جو قوتیں ہمارے علم میں آچکی ہیں ان کے متعلق صحیح ایمان یہ ہو گا کہ ان سب کو انسان کے سامنے جھکنا چاہئے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے کائناتی قوتیں نہیں جھکتیں وہ قوم (قرآن کی رو سے) صف آدمیت میں شمار ہونے کے بھی قابل نہیں چہ جائیکہ اسے جماعت مومنین کہا جائے۔

اب آپ سوچئے کہ جس قوم کے ایمان میں یہ چیز داخل تھی کہ کائناتی قوتوں کو آدمی کے سامنے جھکنا چاہئے وہ قوم اگر ان قوتوں کے سامنے جھکی ہوئی ہو (ان قوتوں کے سامنے ہی نہیں بلکہ ان قوموں کے سامنے جنہوں نے ان قوتوں کو اپنے سامنے جھکایا ہوا ہے) تو اس قوم کی پستی کی کوئی انتہا ہو سکتی ہے۔ یاد رکھئے مقام آدم یہ ہے کہ کائنات کی تمام قوتیں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں اور مقام مومن یہ ہے کہ ان تمام قوتوں کو مسخر کر کے ان کے ماحصل کو قوانین خداوندی کے مطابق نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کیا جائے۔

(لغات القرآن: 245-244)

''جو لوگ وحی پر ایمان نہیں رکھتے وہ ان قوتوں کو طبیعی قوتیں (Physical Forces) کہتے ہیں اور شریعت کی زبان میں انہیں ملائکہ کہا جاتا

ہے لیکن انہیں ملائکہ کہئے یا کائناتی قوتیں حقیقت ایک ہی ہے۔ (لغات القرآن 242)

’’ان قوتوں کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے جو چاہیں کریں (اختیار وارادہ خدا کے بعد صرف انسان کو حاصل ہے) اس لئے یہ قوتیں بلاچون وچرا قانون خداوندی کے مطابق سرگرم عمل رہتی ہیں‘‘۔

(لغات القرآن 242)

ہم کہتے ہیں

پرویز کے اس سارے مضمون کا حاصل یہ ہے کہ ملائکہ سے مراد غیر ذی حیات، بے شعور، بے ارادہ اور اندھی و بہری کائناتی قوتیں ہیں۔ پرویز کی یہ بات قرآن کے صریح خلاف ہے جس کی مندرجہ ذیل وجوہات ہیں:

1- وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ۔

(بقرہ: 177)

لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر۔

اس آیت میں بھی ملائکہ پر ایمان رکھنے کا ذکر ہے اور پرویز نے بھی لکھا ہے کہ ’’قرآن کریم نے ملائکہ پر ایمان کو اجزائے ایمان میں سے قرار دیا ہے‘‘۔ نیز اسی مذکورہ بالا آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ ’’قرآن کی رو سے (یہ) پانچ بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر ایمان لانے سے انسان مومن ہو جاتا ہے۔‘‘

ان حقیقتوں پر ایمان لانا جیسا ہمارے لئے ضروری ہے اسی طرح رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے لئے بھی ضروری تھا۔ اور یہ حقیقتیں تو دائمی ہیں جن کا مطلب زمانے کے گزرنے سے یا سائنسی تحقیقات میں اضافہ سے بدلنے والا نہیں۔ ملائکہ سے آج جو مراد ہے وہی رسول اللہ ﷺ کے دور میں بھی تھی اور وہی نوع انسانی کے تمدن کے ابتدائی دور

میں تھی بلکہ اس سے بھی بہت پہلے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے ملائکہ سے کیا مراد لیا تھا۔ اگر انہوں نے بھی ان سے کائنات کی غیر ذی حیات بے شعور بے ارادہ اور اندھی بہری قوتیں مراد لی تھیں تو اس کی نقل کی کوئی دلیل ہونی چاہئے۔ ایسی کوئی دلیل نہ تو پرویز کے پاس ہے اور نہ ہی پرویز کے ہمنواؤں کے پاس ہے۔ اور اگر وہ ان سے ذی حیات، ذی شعور اور ذی ارادہ مخلوق مراد لیتے تھے تو پرویز اور ان کے ہمنواؤں کو کیا حق ہے کہ وہ ایک غیر متبدل حقیقت کا معنی محض اپنی عقل کی بنیاد پر بدل ڈالیں۔

2- قرآن پاک کی بہت سی آیات ملائکہ کے ذی حیات اور ذی شعور ہونے پر صاف صاف دلالت کرتی ہیں۔

i- فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا۔ (آل عمران: **39**)

پھر آواز دی زکریا کو فرشتوں نے جب کہ وہ حجرے کے اندر کھڑے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ تم کو خوشخبری دیتا ہے یحیٰی کی جو گواہی دے گا اللہ کے ایک حکم کی اور سردار ہوگا۔

ii- وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ آيَةَ مُلْكِهٖ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوْسٰى وَآلُ هَارُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ۔ **(بقرہ: 248)**

اور کہا بنی اسرائیل سے ان کے نبی نے کہ طالوت کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ آئے گا تمہارے پاس ایک صندوق جس میں سکینہ ہے تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جو چھوڑ گئی تھی موسیٰ اور ہارون کی اولاد اٹھا لائیں گے اس کو فرشتے۔

iii- اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ۔ (سورہ احزاب: **56**)

بلاشبہ اللہ نبی پر رحمت نازل کرتا ہے اور اس کے فرشتے نبی کیلئے دعائے رحمت کرتے ہیں۔

-iv فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا o قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا ذَكِيًّا۔ (سورہ مریم: 17-19)

پھر کرلیا مریم نے اپنے لوگوں سے ورے پردہ۔ پھر بھیجا ہم نے اس کے پاس اپنا فرشتہ جس نے مریم کے سامنے پورے آدمی کی شکل اختیار کر لی۔ مریم بولی میں رحمٰن کی پناہ لیتی ہوں تجھ سے اگر تو خدا خوفی کرنے والا ہے۔ وہ بولا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تجھ کو پاکیزہ لڑکا دوں۔

v - اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ o رَبَّنَا وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ نِ الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ o وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ وَمَنْ تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (سورہ مومن: 7-9)

جو (فرشتے) اٹھا رہے ہیں عرش (الٰہی) کو اور جو اس کے گرد میں تسبیح کرتے ہیں اپنے رب کی خوبیوں کے ساتھ اور اس پر یقین رکھتے ہیں اور بخشش طلب کرتے ہیں ایمان والوں کے لئے (ان الفاظ سے کہ) اے ہمارے رب تو رحمت اور علم سے ہر چیز پر حاوی ہے پس بخش دے ان لوگوں کو جو توبہ کرتے ہیں اور تیرے رستے کی پیروی کرتے ہیں اور ان کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب اور داخل کر ان کو ہمیشہ کے باغات میں جن کا تو نے ان سے وعدہ کیا ہے اور (اس کو بھی) جو کوئی نیک ہو ان کے باپوں میں اور ان کی بیویوں میں اور ان کی اولاد میں بے شک تو ہی زبردست حکمت والا ہے۔ اور بچا ان کو برائیوں سے اور جسے تو اس روز برائیوں سے بچا لے تو یہ اس پر رحم ہے تیرا اور یہی ہے بڑی کامیابی۔

-vi عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ (سورہ تحریم: 6)

جہنم کی آگ پر ایسے فرشتے مقرر ہیں جو تندخو اور زبردست ہیں جو اللہ ان کو حکم دیتا ہے اس میں اللہ کی (کچھ بھی) نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کچھ کرتے ہیں جو وہ حکم دئے جاتے ہیں۔

حکم کی نافرمانی نہ کرنے پر تعریف اس وقت کی جاتی ہے جب ان میں نافرمانی کرنے کا ارادہ ہوسکتا ہو۔ تعریف کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ارادوں کو اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنے ہی میں فنا کیا ہوا ہے۔

-vii وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ فَلَمَّا رَآٰ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ۔ (ھود: 69,70)

اور آئے ہمارے بھیجے ہوئے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر (اور) کہا (آپ پر) سلامتی ہو (ابراہیم نے بھی) کہا (تم پر بھی) سلام ہو۔ پھر دیر نہ کی کہ لے آیا ایک تلا ہوا بچھڑا۔ پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ نہیں آتے کھانے کی طرف تو ان سے کھٹکا اور دل میں ان سے خوف محسوس کیا وہ بولے آپ مت ڈریئے ہم کو لوط کی قوم کی طرف (عذاب دینے کیلئے) بھیجا گیا ہے۔

-viii وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ o وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ o قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ وَاِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ o قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ o قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اَلَيْسَ الصُّبْحُ

بِقَرِيبٍ۔ (سورہ ھود 81-77)۔

اور جب آئے ہمارے بھیجے ہوئے لوط کے پاس تو غمگین ہوا اور تنگدل ہوا ان کی وجہ سے اور کہا آج بڑا سخت دن ہے۔ اور آئی لوط کے پاس ان کی قوم بے اختیار دوڑتی ہوئی اور وہ (قوم کے لوگ) پہلے ہی سے برے کام کرتے تھے۔ لوط نے کہا اے میری قوم یہ میری بچیاں (جو تمہارے نکاح میں ہیں یہ) پاک ہیں تمہارے لئے سو ڈرو اللہ سے اور مجھے میرے مہمانوں میں مت رسوا کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی نیک چلن مرد نہیں ہے۔ قوم نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آپ کی بچیوں سے کچھ غرض نہیں ہے اور ہماری مراد تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ لوط نے کہا کاش مجھ کو تمہارے مقابلہ میں زور حاصل ہوتا یا میں جا بیٹھتا کسی مستحکم پناہ میں۔ (اس وقت مہمان) بولے اے لوط ہم تو آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں (اور ہم تک تو کیا) یہ آپ تک بھی ہرگز نہیں پہنچ سکتے سو اپنے گھر والوں کو رات کے ایک حصہ میں لے چلئے سوائے اپنی بیوی کے کہ اس کو بھی وہی عذاب پہنچے جو اور قوم کو پہنچے گا۔ ان کے وعدہ کا وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں ہے۔

آٹھویں غلطی: ابلیس کا موجود فی الخارج ہستی ہونے کا انکار کرنا

پرویز کہتے ہیں:

”کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو قوانین خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے ان سے سرکشی برت لے۔ کائنات کی کسی اور شے کو معصیت (قانون خداوندی کی خلاف ورزی) کا اختیار نہیں دیا گیا۔ انسان، قانون خداوندی کی اطاعت سے سرکشی اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے یہ جذبات اسے (عالمگیر مفاد کلی کے مقابلہ میں) ذاتی مفاد پرستی پر ابھارتے ہیں اور وہ قوانین خداوندی کو پس پشت ڈال کر ان مفادات کے پیچھے لگ جاتا ہے۔

پھر اس کی عقل اسے وہ طریقے بتاتی ہے جس سے وہ ان مفادات کو حاصل کر سکے۔ قرآن کریم نے ایسے جذبات اور ان کے بروئے کار لانے والے سامان و ذرائع (عقل حیلہ جو کے بتائے ہوئے طرق وحیل) کو ابلیس کہہ کر پکارا ہے اور اس کی سرکشی کی بنا پر اس کے متعلق کہا ہے کہ اس کی تخلیق آتش (نار) سے ہوئی ہے۔ اور چونکہ انسانی جذبات آنکھوں سے پنہاں ہوتے ہیں اور غیر محسوس طور پر مصروف عمل رہتے ہیں اس لئے كَانَ مِنَ الْجِنِّ کہا ہے (جن کے معنی ہیں چھپا ہوا)۔“ (لغات القرآن: 44-343)

پرویز کی اس عبارت کا حاصل یہ ہے کہ ابلیس سے مراد مفاد کلی کے برخلاف ذاتی مفاد پر ابھارنے والے جذبات ہیں۔ لیکن اپنی کتاب مطالب الفرقان میں پرویز نے ابلیس سے مراد کو بالکل بدل دیا۔ لکھتے ہیں:

”انسان کو کچھ جذبات دئے گئے ہیں جن کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اس کی زندگی برقرار رہتی ہے۔ لہٰذا ان جذبات کی تسکین خود انسانی زندگی کا تقاضا ہے۔ مادی تصور حیات کی رو سے ان تقاضوں کو (حیوانات کی طرح) جس طرح جی چاہے پورا کیا جا سکتا ہے لیکن قرآنی تصور حیات کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ان تقاضوں کو ان پابندیوں کے دائرے کے اندر رہ کر پورا کیا جائے جنہیں مستقل اقدار خداوندی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً افزائش نسل کے لئے جنسی جذبات کی تسکین ضروری ہے۔ ایک شخص ان کی تسکین کے لئے اپنی بیوی کے ساتھ اختلاط کرتا ہے، دوسرا ان کی تسکین کسی پاک دامن شریف النفس لڑکی کی عصمت دری کے ذریعہ۔ جذبات کی تسکین دونوں صورتوں میں ہو جاتی ہے لیکن ایک طریق اپنے اندر خیر کا پہلو لئے ہوئے ہے اور دوسرا طریق شر کا۔ قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے جذبات کو سرکش اور بے باک نہ رکھو بلکہ ان کی تسکین اقدار خداوندی کی رہنمائی میں کرو...... یعنی قرآن کریم کی رو سے جذبات کی تسکین کوئی برا فعل نہیں۔ ہدایت خداوندی سے سرکشی برت کر ان کا

پورا کرنا شر، جرم یا گناہ ہے۔اسے اس نے شیطانی فعل کہہ کر پکارا ہے......

قرآن کی رو سے شیطان یا ابلیس کوئی موجود فی الخارج ہستی یا شخصیت نہیں۔ یہ خود انسان کے اپنے ہی فیصلوں کا نام ہے۔

(مطالب الفرقان:ص51 ج2)

اس جگہ جذبات تو ضرورت کی چیز بن گئے اور ابلیس سے مراد انسان کا وہ فیصلہ ہو گیا کہ جذبات کی تسکین وہ جائز طریقے سے کرے یا ناجائز طریقے سے کرے۔

ہم کہتے ہیں کہ ابلیس سے جذبات مراد لینا یا انسانی فیصلے مراد لینا دونوں ہی غلط ہیں کیونکہ:

1- جذبات تو غیر اختیاری قوت ہے جس کا اپنی حد سے بڑھ کر کسی قسم کی سرکشی کرنا متصور ہی نہیں ہے۔ رہا انسانی فیصلہ تو وہ انسانی فعل ہے جس پر انسان ماخوذ ہوتا ہے بس اتنا فرق ہے کہ زنا کا عزم و فیصلہ قلبی فعل ہے جب کہ خود زنا اعضاء و جوارح کا فعل ہے۔

2- پرویز نے خود کہا ہے کہ ”کائنات میں صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو وہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرے اور چاہے ان سے سرکشی برت لے۔کائنات کی کسی اور شے کو معصیت کا اختیار نہیں دیا گیا“۔

ابلیس سے مراد جذبات لیں یا ان کو بروئے کار لانے کے طریقے لیں یا انسانی فیصلے لیں ان میں سے کوئی بھی بذات خود انسان نہیں ہے لہٰذا ان میں سے کسی کو بھی معصیت کا اختیار نہیں جب کہ ابلیس کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

فَسَجَدُوْا اِلَّا اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ۔ (سورہ کھف: 50)

سب فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ تھا وہ جنوں میں سے اور اس نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔

قرآن کی بات تو ظاہر ہے غلط نہیں ہوسکتی لہٰذا لامحالہ پرویز کی بات ہی غلط ہے۔

3- ابلیس بھی ایک حقیقت ثابتہ ہے اور مرور زمانہ سے اس کی حقیقت نہیں بدلتی۔ اس

وقت اس سے جو مراد ہے وہی مراد نبی ﷺ اور صحابہ کے دور میں بھی تھی۔ پرویز نے ابلیس سے جو مراد اس دور میں لی ہے کیا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ نے بھی یہی مراد لی تھی۔ اگر یہی تھی تو اس کی دلیل چاہئے اور اگر یہ نہیں تھی تو پرویز اور ان کے ہمنواؤں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ قرآن کے مفاہیم کو بدلیں۔

4- قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ۔ (سورہ ص: 76)

ابلیس نے کہا میں آدم سے بہتر ہوں آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ پرویز نے نظریہ ارتقاء کے واسطہ میں سہی انسان کا مٹی سے پیدا ہونے کا اقرار کیا ہے۔ اس آیت کے مطابق ابلیس نے آدم سے تقابل کرتے ہوئے کہا کہ مجھے آگ سے پیدا کیا ہے جو حقیقت کا تقاضا کرتی ہے۔ لیکن قرآن کے برخلاف پرویز کہتے ہیں کہ اس کی تخلیق آگ سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی سرکشی کی بنا پر (مجازا) کہا ہے کہ اس کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔

5- لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ (سورہ ص: 85)

(اللہ تعالیٰ نے ابلیس سے کہا) میں ضرور بھروں گا جہنم کو تجھ سے اور ان میں سے جو تیری پیروی کریں گے سب سے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جہنم ایسی جگہ ہے جو انسانوں اور ابلیس سے بھری جائے گی پھر ابلیس سے اگر جذبات یا انسانی فیصلے مراد ہوں تو ان سے جہنم کو بھرنا بے معنی بات ہے کیونکہ یہ معنوی چیزیں ہیں جو کوئی جگہ نہیں گھیرتیں۔